سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سیمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سیمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سیمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف ۸۲ء سے لے کر ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۴ روپیے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپیے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپیے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

"منیجر"

جلد ۱۴۶ ماہ جمادی الاولی سنہ ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۹۰ء عدد ۶

مضامین

مقالات

دار المصنفین کی نئی کتاب

شذرات سلیمانی از مولانا سید سلیمان ندویؒ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک کے شذرات معارف کا مجموعہ، قیمت ۴۵ روپیے۔

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں فی شمارہ چار روپیے، سالانہ چالیس روپیے۔

پاکستان میں سالانہ چندہ سنو روپیے

چندہ بھیجنے کا پتہ: حافظ محمد یحیی، پہلی منزل شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ۔ کراچی۔ پاکستان

بیرونی ملکوں میں: ہوائی ڈاک سے سالانہ چندہ ۱۰ پونڈ یا ۱۶ ڈالر

بحری ڈاک سے سالانہ چندہ ۳ پونڈ یا ۵ ڈالر

"منیجر"

شذرات

آہ! مولانا ابو اللیث صاحب

قارئین کو اخباروں سے جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کی المناک وفات کی خبر مل چکی ہوگی، موت سے کسی کو مفر نہیں، لیکن مسلمانوں میں پہلے ہی سے قحط الرجال ہے، بے غرض، بے ریا اور اخلاص سے کام کرنے والوں کا فقدان ہے، وہ بڑے نازک اور پُرآشوب دور سے گذر رہے ہیں، ان کی مشکلات اور دشواریاں سوا ہوتی جارہی ہیں، ان کے مسائل کی پیچیدگی اور الجھاؤ میں برابر اضافہ ہورہا ہے اور قومی و ملّی زندگی کے ہر شعبہ میں نہ پُر ہونے والا خلا بڑھتا جارہا ہے، ان حالات میں صفِ اول کے ایک صائب الرائے، تجربہ کار، معتدل مزاج، پُرخلوص اور دردمند رہنما کا اٹھ جانا کس قدر حسرتناک ہے، اس کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے، جماعت کے باہر کے لوگ بھی ان کی فہم و فراست، شرافت و سلامت روی، دور اندیشی اور معاملہ فہمی کے پوری طرح معترف تھے۔

امارت کے منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنے گاؤں چاند پٹی (اعظم گڈھ) میں رہنے لگے تھے، یہیں یکم دسمبر کو فجر کی نماز جماعت سے ادا کرنے کے بعد حسب معمول ٹہلنے نکلے، تھوڑی دور جانے کے بعد تکلیف اور کمزوری محسوس کی اس لیے گھر لوٹ آئے، مقامی ڈاکٹرن کے علاج سے آرام نہ ہوا تو اسی روز شب میں اعظم گڈھ لائے گئے، ۲ دورات اپنے عزیز ڈاکٹر وقار احمد کے گھر پر گذار کر ۳ دسمبر کو ان کے نرسنگ ہوم میں داخل ہوئے، میں صبح و شام دیکھنے جاتا، صرف ایک روز کچھ بات چیت ہوئی، بڑا شدید قلبی دورہ تھا، بس یہی کہتے "اے اللہ رحم فرما" آخر ۵ دسمبر کو ۱۰ بجے دن اللہ نے ان پر رحم کیا اور اپنے یہاں بلالیا، اسی دن ۴½ بجے شام ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں پیوند خاک ہوگئے منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرى۔

تعلیم کی تکمیل ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوئی لیکن اس سے پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں رہے

جس سے ان کا تعلق ہمیشہ گہرا رہا، ۱۹۳۳ء میں فراغت کے بعد وہ ندوہ ہی میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، اس تابناک دور میں شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی کی خدمات بھی ندوہ کو حاصل ہوگئی تھیں، جن سے استفادہ کرنے والوں میں یہ بھی پیش پیش رہے، شیخ کے فیض سے عربی بولنے اور لکھنے کی جو اچھی مشق ہوگئی تھی وہ آخر تک باقی رہی، اسلام اور مستشرقین پر دارالمصنفین کے بین الاقوامی سمینار کے لیے انھوں نے عربی زبان ہی میں اپنا مقالہ لکھا تھا، اسی زمانہ میں ندوہ سے مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب نے ایک عربی رسالہ "الضیاء" کے اجراء کا فیصلہ کیا، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم تو اڈیٹر ہی تھے، دوسرے گنے چنے مضمون نگاروں میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور مولانا محمد ناظم ندوی کے علاوہ ان کا نام بھی تھا، اس کے لیے انھوں نے متعدد اچھے اور مفید مضامین بھی لکھے اور حضرت سید صاحبؒ کے مضمون "ہندوستان میں علم حدیث" کا عربی ترجمہ بھی کیا۔

سنہ ۳۵ء میں وہ بجنور تشریف لے گئے اور مشہور قوم پرور اخبار مدینہ بجنور کے شریک ادارت ہوئے، یہیں سے ان کی ادارت میں ایک علمی و دینی ماہنامہ "فاران" نکلا، سنہ ۳۶ء میں مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے خلاف غوغائے تکفیر بپا ہوا، اور ایک صاحب کا رسالہ "علامہ سید سلیمان ندویؒ کی قرآنی غلطیاں" شائع ہوا تو انھوں نے اس میں ان کے مدلل جواب لکھے، سنہ ۳۶ء ہی میں مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں "الاصلاح" نکلا جس کے خاص مضمون نگاروں میں مولانا ابو اللیث بھی تھے، اس میں ان کا ایک اہم مضمون "قرآن مجید میں تکرار کی نوعیت اور قصۂ آدم" کئی نمبروں میں شائع ہوا، بجنور سے وہ مدرسۃ الاصلاح آگئے، اور "الاصلاح" بند ہونے پر اس سے ہلکا پھلکا رسالہ "اصلاح" انکی ادارت میں شائع ہوا مگر وہ شعلۂ مستعجل نکلا۔

ندوۃ العلماء ہی میں ان پر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی متکلمانہ تحریروں کا اثر ہونے لگا تھا، خود ان کے مضامین بھی ترجمان القرآن میں چھپتے تھے، جماعت اسلامی کے قیام کے بعد وہ اس میں شامل ہوئے اور اب انتقال کے بعد ہی اس سے علحدہ ہوئے، اس راہ میں قید و بند اور طرح

کی صعوبتیں جھیلیں، ملک کی تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کی جماعت کے امیر ہوئے درمیان کے چند برسوں کو چھوڑ کر قیادت مسلسل ان ہی کے پاس رہی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ اتنے طویل عرصہ تک مسلمانوں کی کسی جماعت کا امیر بنے رہنا معجزہ ہی ہے، انھوں نے قومی کارزار میں جب قدم رکھا تھا تو کسی کو وہم و گمان بھی نہ رہا ہوگا کہ وہ اس خوش اسلوبی کے ساتھ جماعت کو انتشار سے بچا کر اسے وسعت و ترقی دیں گے لیکن ان کے تدبر اور انتظامی قابلیت کے جوہر اسی وقت کھلے، دراصل اس کے لیے جس پختہ سیرت، اعتدال طبع اور اولوالعزمی کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی، امارت کے زمانہ میں ملک و ملت کے مسائل پر ان کے مفید خیالات "زندگی" رام پور میں شایع ہوئے اور بعض کتابیں بھی لکھیں

ان کی وسعتِ اخلاق نے ان کو تمام حلقوں میں مقبول بنا دیا تھا، جماعت کے مخالفین بھی ان کا لحاظ و احترام کرتے تھے، وہ مہر و مروت کے پتلے، ہر شخص کے ہمدرد اور مرنج و مرنجاں شخص تھے اپنے نیازمندوں اور خوردوں سے بھی خوش اخلاقی اور بشاشت سے پیش آتے اور نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے، ان میں نخوت و رعونت کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا، سادگی، اخلاص، دردمندی، خاکساری اور فروتنی ان کی سیرت کی ممتاز خصوصیتیں تھیں جو ہر شخص کو متاثر کر لیتی تھیں ان کا رتبہ بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے کو بڑا سمجھا اور نہ یہ ظاہر کیا کہ وہ مسلمانوں کی بہت منظم اور بااثر جماعت کے امیر ہیں، دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی کا اظہار ان میں نہ تھا، نام و نمود سے بڑی نفرت تھی، دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہ کی، ان کی ساری عزت و شہرت اور نیک نامی ان کی ذاتی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے تھی، دراصل یہی بڑائی پایدار ہوتی ہے

دارالمصنفین سے ان کو ہمیشہ بڑا تعلق رہا، وہ حضرت سید صاحبؒ کے عزیز شاگرد تھے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمن سے ان کے بڑے مخلصانہ روابط تھے، مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے تھے، وہ جب اعظم گڑھ آتے تو دارالمصنفین ضرور آتے، اللہ تعالیٰ ان کے مراتب و درجات بلند کرے آمین

مقالات

دہلی کے اکابر صوفیہؒ

از

پروفیسر خلیق احمد نظامی

حالیؔ نے دہلی کو مخاطب کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا ؎

شاذ و نادر تھا تصوف میں کوئی تیرا نظیر　　آب و گل کا تیرے تھا گویا تصوف سے خمیر

تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ مہر منیر　　تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مستنیر

آج جس دولت کا بازارِ جہاں میں کال ہے

تیرا قبرستان اس دولت سے مالامال ہے

اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا، صدیوں تک دہلی تصوف کا گہوارہ رہی تھی اور صوفیہ کے پہلے قافلے نے یہاں اپنا رخت سفر کھولا تھا، اس کی فضاؤں میں مدتوں علم و عرفان، ارشاد و تلقین، رشد و ہدایت کے زمزمے گونجتے رہے، یہاں انسان کا رشتہ اللہ سے جوڑنے اور انسانی قلوب میں انسانیت کا احترام پیدا کرنے کی جد و جہد صدیوں تک جاری رہی، سیاسی عروج و زوال کی کتنی ہی داستانیں اس کے صفحات پر لکھی گئیں، لیکن صوفیہ کی سرگرمیوں اور ان کے مقصد و منہاج میں کبھی فرق نہ آیا، وقت کا سیل رواں بارہا ان سے

ؒ توسیعی خطبہ جو اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام ۲۵ مارچ ۱۹۹۰ء کو غالب اکیڈمی میں پیش کیا گیا۔

ٹکراتا ہوا گذرا، لیکن "عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام"۔ ان کے وجود محبت
وشفقت کے قلعے تھے، جہاں انسانیت کو پناہ ملی، حالی نے جس چیز کا کال اپنے زمانے
میں محسوس کیا تھا، وہ آج بھی جنس نایاب ہے، بلکہ بقول اقبال ؎

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں ؛ شعلہ ہے مثل چراغ لالۂ صحرا ترا

قرون وسطیٰ میں افریقہ اور ایشیا کے کم خطے ایسے رہے ہوں گے جہاں صوفیہ کے
جماعت خانے، خانقاہیں، رباط، زاویے، یا دائرے قائم نہ ہوئے ہوں، لیکن چار
مقامات ایسے تھے جہاں تصوف کی تحریک نے نشو و نما پائی، اس کی فکر کی تدوین ہوئی
اور وہاں سے اس کے اثر و نفوذ کا دائرہ دور دور تک پھیلا، یہ چار مقام بخارا،
بغداد، دمشق اور دہلی تھے، جب بخارا، بغداد اور دمشق کو غُز اور منگولوں کی تباہ کاریوں
نے نیست و نابود کر دیا تو دہلی تصوف کا ملجا اور ماویٰ بن کر ابھری اور صدیوں تک
تصوف کی فکر اور ادارے اس کے دامن میں پرورش پاتے رہے، عصامی نے
لکھا ہے ؎

بسے سیدان صحیح النسب	رسیدند در دے ز ملک عرب
بسے کاسبان خراساں زمین	بسے نقشبندان اقلیم چین
بسے عالمان بخارا نژاد	بسے زاہد و عابد از ہر بلاد
حکیمان یوناں، طبیبان روم	بسے اہل دانش ز ہر مرز و بوم
دراں شہر فرخندہ جمع آمدند	چو پروانہ بر نور شمع آمدند

ہر چند کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ "بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا"، لیکن آج بھی
اس کی فضا دل فروز ہے، اور اس کی ہواؤں میں اب بھی وہ نغمے محفوظ ہیں جنھوں نے

دِلّی کی سماجی زندگی کو توانائی بخشی تھی۔

دہلی میں تصوف کی روایت کو قائم کرنے اور اس کے اداروں کے لیے سازگار
فضا پیدا کرنے میں سلطان شمس الدین ایلتتمش کا بہت بڑا ہاتھ تھا، اس کے یہ معنی
نہیں کہ تصوف کی تحریک نے سیاسی اقتدار کے سایے میں پرورش پائی تھی، بلکہ
اس کا پس منظر ایلتتمش کی ابتدائی زندگی ہے جو بغداد و بخارا میں فقراء و مشایخ کے
دامن تربیت میں گذری تھی، وہ وہاں کی خانقاہوں میں عقیدتمندانہ حاضر ہوا کرتا
تھا، شیخ سعدیؒ کے پیر اور اپنے وقت کے مشہور بزرگ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ
کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی توجہ کا طالب ہوا تھا، اس عسرت اور پریشانی کے
زمانے میں اس نے بقول مولانا منہاج السراج ایک فقیر سے یہ عہد بھی کیا تھا کہ
اگر وہ کبھی صاحبِ اقتدار ہو گیا تو صوفیہ و مشایخ کے حقوق کی پاسبانی کو اپنا فرض سمجھے گا،
قسمت نے اس کو دہلی پہونچایا اور یہاں قرونِ وسطیٰ کی سب سے بڑی سلطنت
کا تخت و تاج اس کو نصیب ہوا، حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا بیان ہے کہ

"او خدمت شیخ شہاب الدین	وہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ
سہروردی را و شیخ اوحد الدین	اور شیخ اوحد الدین کرمانیؒ
کرمانی را رحمۃ اللہ علیہم دریافتہ بود	سے ملا تھا، اور ان میں سے ایک
و یکے ازیشاں گفتہ بود تو بادشاہ	بزرگ نے یہ فرمایا تھا کہ تو
خواہی شد"۔ (فوائد الفواد)	بادشاہ ہوگا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے تہذیبی اور ثقافتی اداروں کی داغ بیل اسی کی کوششوں
کی رہین منت ہے، اس نے بہت سی مضمحل صلاحیتوں کو جن میں حوادث زمانہ نے

"آرزو کی بے نشی" پیدا کر دی تھی، اور جو زندہ تھے تو اس لیے کہ "نہ مرنے کا نام زندگی" تھا، ایک نئے معاشرہ کی تعمیر میں لگا دیا، ایک طرف اس کے عزم جہاں بانی نے قنوطیت کی فضا کو دور کیا، دوسری طرف اس کی تصوف سے دلچسپی نے اعلیٰ روحانی اور اخلاقی قدروں کے ذریعہ عروق مردہ میں بامقصد زندگی کا خون دوڑا دیا، حوض شمسی اور قطب مینار محض تعمیری کارنامے نہیں تھے، ان کے پیچھے ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کا جذبہ کارفرما تھا جس میں وسط ایشیا کی پژمردہ صلاحیتیں زندگی کی نئی امنگ سے ہمکنار ہوئیں، حوض شمسی کی تعمیر میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سلطان کو مدد دی، دہلی کے ابتدائی دور کا ثقافتی مرکز، حوض شمسی کے کنارے ابھرا، جہاں نہ صرف اولیاء مسجد وجود میں آئی بلکہ دہلی کی ثقافتی زندگی کا مکمل عکس اس میں نظر آنے لگا، سیاسی تذکرہ نویسوں نے التتمش کی سیاسی زندگی کی عظمت اس کے عزم جہاں بانی اور عسکری صلاحیتوں میں دیکھنے کی کوشش کی، لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ اس کی بخشش حوض شمسی بنانے کی وجہ سے ہوئی جس سے دہلی کو پانی ملا، حضرت محبوب الٰہیؒ ہی نے اس کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ وہ شب بیدار تھا، اور رات کا کافی حصہ عبادتِ الٰہی میں گذارتا تھا، یہ ممکن نہ تھا کہ اس کی مذہبی دلچسپیاں اور اس کا طرز زندگی دہلی کی فضا پر اثر انداز نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ التتمش نے دہلی میں وہ فضا پیدا کر دی جس میں صوفیہ مشائخ سیاسی اقتدار سے دور ایک گونہ اطمینان کے ساتھ جھونپڑوں میں بیٹھ کر انسان کو اس کے خالق سے ملانے اور انسانی دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں پرونے کا کام انجام دے سکے، معاصر مورخ منہاج السراج کا بیان ہے:

"غالب ظن آنست کہ ہرگز بادشاہے بحسن اعتقاد و آب دیدہ و تعظیم علماء و مشائخ مثل او از مادر خلقت در قماط سلطنت نیامدہ" (طبقات ناصری)	ظن غالب یہ ہے کہ کوئی بادشاہ جو علماء و مشائخ کی اس درجہ تعظیم کرتا ہو اور اتنا اعتقاد رکھتا ہو پیدا ہی نہیں ہوا۔

اس نے صدہا علماء و مشائخ کو جو وسط ایشیا کے بے رحم حالات سے عاجز ہو کر ادھر کا رخ کر رہے تھے، دہلی میں پناہ دی، ان کا پرجوش خیر مقدم کیا، اور کبھی کبھی شاہی مہمان بھی رکھا، بعض اوقات تو ایسا ہوتا تھا کہ جب کسی بزرگ کی آمد کی خبر ملتی تھی تو میلوں تک استقبال کے لیے نکل جاتا تھا، جب شیخ جلال الدین تبریزیؒ بغداد سے دہلی تشریف لائے تو سلطان ان کے استقبال کے لیے دور تک گیا، اور

"چوں شیخ را دید از اسپ فرود آمدہ بجانب ایشاں دوید" (سیر العارفین)	جوں ہی شیخ کو دیکھا گھوڑے سے اتر پڑا اور ان کی طرف دوڑا۔

حضرت سید محمد گیسو درازؒ کا بیان ہے کہ ہر جمعہ کی رات کو وہ فقیروں اور بوڑھی عورتوں کے گھر پر جاتا تھا، "ان کو ماں" کہہ کر پکارتا تھا، اور تنکے اور مٹھائیاں دیتا تھا، قطب صاحبؒ اپنے سلسلے کی روش کی پابندی کرتے ہوئے دربار میں جانا پسند نہیں کرتے تھے تو سلطان نے ہفتہ میں دو بار ان کی قیام گاہ پر حاضری کو اپنا معمول بنا لیا تھا، "رسالہ حال خانوادۂ چشت" میں لکھا ہے کہ ایک بار انھوں نے سلطان کو ہدایت کی تھی:

"اے والیٔ دہلی! باید کہ باغریباں و فقیران و درویشاں و مسکیناں	اے والیٔ دہلی! تجھے چاہیے کہ غریبوں، فقیروں، مسکینوں کے ساتھ

نیکو باشی و با خلق نیکوئی کنی و رعیت	نیکی سے پیش آئے، اور خلق خدا
پرور باشی، ہر کہ با رعیت رعایت	کے ساتھ نیکی کرے اور رعیت پرور
کند و با خلق نیکوئی کند خدائے تعالیٰ	ہو، جو بھی رعیت کے ساتھ رعایت
اورا نگاہ دارد و جملہ اعدار او	کرتا ہے اور خلقت کے ساتھ
(را) دوست دارند"	نیکی کا برتاؤ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکی
	حفاظت کرتا ہے اور اس کے دشمن
	بھی اس کو دوست سمجھنے لگتے ہیں

ایلتمش کے کردار کی کشش اور مشایخ سے عقیدت کی شہرت نے باہر سے آنے والے صوفیہ کے قدم دہلی میں روک لیے، دہلی کے جن مشایخ سے اس کے خصوصی مراسم قائم ہوئے ان میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، خواجہ موئیز دوزؒ سید نور الدین مبارک غزنویؒ، شیخ نجیب الدین نخشبیؒ وغیرہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں پھر دہلی میں صوفیہ کی بہت سی رسوم و روایات بھی ایلتمش کی وجہ سے قائم ہوئیں، جب قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے سماع کی محفلیں منعقد کرنی شروع کیں تو قاضی سعد اور قاضی عماد نے سلطان سے شکایت کی، معاملہ کی حیثیت شرعی تھی اس لیے محضر طلب کیا گیا، قاضی حمید الدین ناگوری نے سلطان کو بچپن کا وہ واقعہ یاد دلایا جب بغداد کی ایک محفل سماع میں وہ تمام رات ایک نوکر کی حیثیت سے مشایخ کی خدمت میں حاضر رہا تھا، اور مشایخ نے اس خدمت سے خوش ہوکر

دراں شب ترا ملک ہندوستاں بدادند زاں چاکری عارفاں

(فتوح السلاطین)

اپنی ابتدائی زندگی کا یہ واقعہ اس کے پردۂ ذہن پر ایک تصویر کی طرح دوڑ گیا، اس نے قاضی حمید الدین ناگوری سے معذرت کی اور سماع پر کوئی پابندی عاید نہیں کی فوائد الفواد میں لکھا ہے کہ دہلی میں سماع کا رواج قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے ذریعہ ہوا، دہلی کے قاضی مولانا منہاج الدین نے جب ان کی ہم نوائی کی تو سماع کا رواج عام ہوگیا، سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد تک ایلتمش کے اس فیصلہ کا احترام ہوتا رہا، اور دہلی میں صوفیہ کی کسی محفلِ سماع پر پابندی عائد نہیں کی گئی۔

ایلتمش کے زمانے میں دہلی میں چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ مشایخ کی خانقاہیں قائم ہوئیں، اور بہت سے متفرق صوفی گروہ یہاں آکر بس گئے، طوسی، حیدری، قلندری وغیرہ سب نے اپنے زاویے قائم کر لیے، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ان کے بہت سے خلفاء ہندوستان میں مقیم ہیں، ان میں سید نور الدین مبارک غزنویؒ، شیخ ترک بیابانیؒ، مولانا مجد الدین حاجیؒ، شیخ ضیاء الدین رومیؒ دہلی میں مقیم رہے، لیکن بعض اسباب کی بنا پر جن کا ذکر سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے، دہلی سہروردی سلسلہ کا مرکز نہ بن سکی گو بعض مشایخ سلسلہ مختلف اوقات میں یہاں سرگرم عمل رہے، فردوسی سلسلہ کی خانقاہیں شیخ رکن الدین فردوسیؒ، شیخ نجیب الدین فردوسیؒ نے قائم کیں، لیکن اس سلسلہ کو دہلی سے زیادہ بہار میں عروج حاصل ہوا، جہاں شیخ نجیب الدین فردوسیؒ کے خلیفہ شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے تصوف کی تعلیم اور سلسلہ کی تنظیم کو پھیلانے کے لیے پُر خلوص اور مسلسل جد وجہد کی۔

ایلتمش کے بعد پوری ایک صدی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ دہلی میں بقول

صاحب صبح الاعشیٰ دو ہزار خانقاہیں رشد و ہدایت کے چراغ جلائے ہوئے نظر آنے لگیں، سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں ایلتمش کی بسائی ہوئی دِلّی نے آخری سانس لیا، خانقاہوں میں خاک اڑنے لگی اور بقول سید محمد گیسو درازؒ قطب صاحبؒ اور حضرت محبوبؒ الٰہی کی درگاہوں کے علاوہ کہیں چراغ بھی نظر نہ آتا تھا، یہاں کے بیشتر صوفیہ جبراً دکن بھیج دیے گئے اور دہلی میں ایک ہو کا عالم ہوگیا، لیکن دہلی کی قسمت میں بن بن کر بگڑنا اور بگڑ بگڑ کر بننا لکھا تھا، فیروز شاہ نے اس کو از سرِ نو آباد کیا، اور دہلی کی عظمت گذشتہ پھر واپس آگئی، اس کے بعد دہلی سیاسی عروج اور زوال کی بہت سی منزلوں سے گذری، کتنے ہی خاندان تخت پر آئے اور ختم ہو گئے، بیرونی حملہ آوروں کی فوجیں اس کے دروازوں پر کھڑی رہیں، سیاسی اقتدار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا، لیکن یہاں کی خانقہی زندگی اور صوفیہ کی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا، ہوا جتنی تیز و تند ہوئی اتنا ہی چراغ کو روشن رکھنے کا جذبہ مضبوط ہوتا رہا، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا بیان ہے کہ محمد شاہ کے زمانے میں بائیس۲۲ صاحبِ ارشاد بزرگ ہر خانوادہ کے دہلی میں موجود تھے، غالباً اسی وقت سے "بائیس خواجہ کی چوکھٹ" کا جملہ رائج ہوا، یہ زمانہ وہ تھا جب دہلی تیزی کے ساتھ سیاسی زوال کی منزلیں طے کر رہی تھی۔

دہلی میں ٹھہر کر سانس لینے اور اپنا روحانی سرمایہ منتظم کرنے کے بعد صوفی سلسلے اس قابل ہوئے کہ ملک کے مختلف حصوں میں پہونچ کر تصوف کے اداروں کی داغ بیل ڈالیں، صدیوں تک تصوف کی تحریک کا دل دہلی میں دھڑکتا رہا، اور یہاں فکر و نظر کے سانچے ڈھلتے رہے، گلزار ابرار کے مصنف کا بیان ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے

سات سو خلفاء ملک کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے، دہلی کے روحانی سفیروں کی یہ جماعت جو عشق الٰہی میں غرق اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار تھی، ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی، اس زمانہ میں چشتیہ سلسلہ کو کل ہند حیثیت حاصل ہوگئی اور تصوف کی تحریک ایک عوامی تحریک بن گئی، شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے ایک دن اپنے مرید اور اس دور کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی کو بتایا تھا کہ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ تصوف کی تعلیم ہر کان تک پہونچا دی جائے اور انسانی زندگیوں میں تبدیلی لائی جائے، تاکہ اخلاق و انسانیت کے اعلیٰ مقاصد پورے ہو سکیں۔

دہلی کی تاریخ میں تصوف کے نشو و نما کا دوسرا اہم دور اس وقت آیا جب حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے اکبر کے آخری زمانے میں مسند ارشاد بچھائی۔ انھوں نے نقشبندی سلسلہ کا پودا کابل سے لاکر دہلی کی سرزمین میں نصب کیا، حضرت شاہ غلام علیؒ کے زمانے میں نقشبندی سلسلہ کی شاخیں ترکستان، شام اور عراق تک پھیل گئیں، نقشبندی سلسلہ ہندوستان کا پہلا روحانی سلسلہ تھا جو بیرون ہند بھی مقبول ہوا، اور اس نے افغانستان سے ترکی تک روحانی اصلاح و تربیت کا ایک نظام قائم کر دیا۔

دہلی میں قادری، شطاری، مغربی سلسلوں کی چند خانقاہیں ضرور قائم ہوئیں لیکن قادری سلسلہ کا فروغ لاہور میں اور شطاری سلسلہ کا گوالیار اور مانڈو میں ہوا مغربی سلسلہ کو گجرات کی آب و ہوا راس آئی، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی سلسلہ کی نمایندگی دہلی میں نہ رہی ہو۔

سلسلوں کی تنظیم سے قطع نظر یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ تصوف کا

سارا فکری سرمایہ جو ہندوستان سے باہر وجود میں آیا تھا دہلی کے دور اول میں ہی یہاں پہونچ گیا، اور یہاں سے ملک کے مختلف حصوں میں منتقل ہوا، قطب صاحبؒ کا وطن اوش تھا، جو پروفیسر میسی نیوں کی تحقیق کے مطابق حلاجی فکر کا اہم مرکز تھا، قطب صاحبؒ کی زندگی اور ان کے فکری رجحانات کے خاموش اشاروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحدت وجودی فکر کا ان پر غلبہ تھا، دہلی میں نظریۂ وحدت الوجود پہلے حلاج منصور اور پھر شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی تصانیف کے ذریعہ پہونچا، اپنشد بقول مولانا ابوالکلام آزاد نظریۂ وحدت وجود کا سب سے پہلا منبع و مخرج تھا، ہندوستان کی فضا اس نظریہ کو راس آگئی اور مسعود بک کے دیوان نورالعین نے اس کو دہلی کی خانقاہوں میں پہونچا دیا، پھر شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی عوارف المعارف کی بنیاد پر خانقہی نظام کی بنیادیں استوار کی گئیں، شیخ اکبر ابن عربیؒ کی کتابیں فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم ملتان ہوتی ہوئی دہلی پہونچیں اور فیروز شاہ تغلق کے مشہور مدرسہ فیروزی کے نصاب میں شامل کرلی گئیں، مطہر نے لکھا ہے ؎

کتابے ز ہر فن بنزدیکِ من	نہادہ چو گنجینۂ گوہری
ز عرفاں عوارف ز وجدان فصوص	ز وعظ و نصائح کتاب سری

مثنوی مولانا روم کا دہلی میں آغاز شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ سے ہوا، حضرت محبوب الٰہی کی وجہ سے تصوف کی جن کتابوں کا رواج ہوا ان کے نام معاصر مورخ ضیاء الدین برنی نے دیے ہیں، ان میں قوت القلوب، احیاء العلوم، کیمیائے سعادت، عوارف المعارف، کشف المحجوب، شرح تعارف، رسالۂ قشیریہ، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، تصوف کی تعلیم، اس کے متقدمین

مشائخ کے حالات زندگی، مختلف روحانی تصورات کے مصادر و منابع سمجھنے کے لیے یہ کتابیں کلیدی اہمیت کی حامل تھیں، ان کی مقبولیت اور عام مطالعہ نے دہلی میں تصوف کی تعلیم کو فروغ دیا، پھر ملفوظات جمع کرنے کی روایت کی ابتداء حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ سے ہوئی اور فوائدالفواد کی تدوین نے مختلف صوفی سلسلوں اور خانوادوں کے مشائخ کی تعلیم کی اشاعت کا ایک نیا ذریعہ پیدا کر دیا، جو دہلی سے سفر کرتا ہوا بنگال، دکن، گجرات مالوہ ہر جگہ پہونچا، اور تصوف کی ترویج و اشاعت میں نئی توانائی پیدا ہوگئی، تصوف سے متعلق لاتعداد کتابیں دہلی میں لکھی گئیں جن میں سے اکثر نے ملک میں رواج پایا، اس لٹریچر میں سب سے ممتاز تصنیف خواجہ میر دردؒ کی علم الکتاب ہے، مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم نے گل رعنا میں صحیح لکھا ہے کہ اگر دردؔ کے علم و فضل کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو علم الکتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے، فکر کی گہرائی، طبیعت کے سوز و گداز، مطالعہ کی وسعت، دینی لٹریچر پر مجتہدانہ نظر نے مل کر علم الکتاب کو تصوف کے لٹریچر میں ایک عظیم الشان شاہکار کی حیثیت دے دی ہے، ہندوستان میں متصوفانہ فکر کے نشو و نما کے وسیع پس منظر میں اس کتاب کا جائزہ اب تک نہیں لیا گیا۔

دہلی میں سلاسل کی تنظیم اور تصوف کے بنیادی تصورات کی تدوین کا ہلکا سا خاکہ پیش کرنے کے بعد چند اکابر مشائخ کی زندگیوں اور ان کے کارناموں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جاسکتی ہے، ظاہر ہے کہ ایک مقالہ میں سب اکابر کی سوانح اور تعلیم کا احاطہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، یہاں ان چند مشائخ کے تذکرہ پر اکتفا کیا گیا ہے جن کے اثرات آج تک دلی کی زندگی پر اثر انداز نظر آتے ہیں دہلی کے مشائخ کا تذکرہ یوں تو صوفیہ کے ہر تذکرہ میں ملتا ہے، سیر الاولیاء،

لے کر تکملۂ سیر الاولیاء تک اور اخبار الاخیار سے لے کر تذکرۂ اولیائے ہند تک لیکن مخصوص اولیائے دہلی کا حال لکھنے کا خیال محمد حبیب اللہ بن شیخ جہاں اکبرآبادی سے پہلے غالباً کسی کو نہیں آیا، انھوں نے سنہ ۱۷۲۹ء میں یہ تذکرہ "ذکر جمیع الاولیائے دہلی" کے نام سے مرتب کیا، اور ماہ وصال کے اعتبار سے دہلی کے بزرگوں کا مختصر حال جمع کر دیا، حبیب اللہ اس کام کے لیے بے حد موزوں تھے، فرخ سیر کے زمانے میں وہ دہلی کے مزارات کے مہتمم رہے تھے، اس سے پہلے وہ زیب النساء کی ملازمت میں تھے اور فتاوائے عالمگیری کا ترجمہ ان کے ذمہ کیا گیا تھا، دہلی کے گورنر محمد یار خان کی شرکت میں انھوں نے لغت کی کئی کتابیں مرتب کی تھیں، قاموس پر حاشیہ بھی لکھا تھا بعد کو محمد شاہ کے دربار سے منسلک ہو گئے، غالباً یہ کتاب اب تک طبع نہیں ہوئی، کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی کتاب موجود نہ تھی، اس لیے اس طرف متوجہ ہونا پڑا، اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں مشایخ کے مزارات کی نشاندہی بڑی احتیاط اور تحقیق سے کی گئی ہے۔

محمد بولاق چشتی کی مطلوب الطالبین اور روضۂ اقطاب سر سید کی آثار الصنادید بشیر الدین کے واقعات دار الحکومت دہلی، خواجہ حسن نظامی کے "بائیس خواجہ کی چوکھٹ" اور دیگر کتب میں دہلی کے مشایخ کا ذکر مختلف نقطہ ہائے نظر سے کیا گیا ہے، مولوی محمد شاہ عالم فریدی نے بھی سنہ ۱۹۱۱ء میں مزارات اولیاء دہلی کے نام سے دو جلدیں شائع کی تھیں، لیکن دہلی کے صوفیہ و مشائخ کا مکمل تذکرہ اب تک کسی تذکرہ نویس کی راہ دیکھ رہا ہے۔

دہلی میں بعض صوفیہ فتح دہلی سے پہلے آ گئے تھے، اس ضمن میں سید محمد گیسو درازؒ کے

اجداد خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لیے کہ ترکوں کی فتوحات سے پہلے اجمیر، بدایوں، قنوج وغیرہ میں مسلمان نوآبادیاں وجود میں آ گئی تھیں۔

دور اول کے اکابر صوفیہ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، شیخ نظام الدین ابو المویدؒ، شیخ مومنہ دوزؒ، اور شیخ بدر الدین غزنویؒ خاص شہرت کے مالک تھے، قطب صاحبؒ اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ دونوں دوست تھے، اور ان کا طرز زندگی بھی یکساں تھا، قطب صاحبؒ پر استغراق کا عالم طاری رہتا تھا، جب حاضرین کا ہجوم ہو جاتا تو ان کو اطلاع کی جاتی، مجمع میں تشریف لاتے اور سورۂ فاتحہ پڑھوا کر حاضرین کو رخصت کر دیتے، کچھ ایسا ہی حال قاضی صاحب کا بھی تھا، ان کے مرشد نے وصیت کی تھی:

"نظارہ در انتظار می باید کرد"

اس کا مفہوم تو وہ خود نہ سمجھ سکے تھے، لیکن رویت الٰہی کے انتظار میں ہمیشہ اپنی آنکھیں بند رکھتے تھے، ایک مرتبہ مولانا شرف الدین کی عیادت کو گئے، انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا کہ جو خدا کو معشوق کہے اس کا چہرہ کیونکر دیکھوں؟ کسی شخص نے آنکھیں بند رکھنے کا سبب پوچھ لیا تو قاضی صاحبؒ نے فرمایا:

"دو چشم ندارم کہ ایں عالم را بہ بینم"

قطب صاحب نے کوئی کتاب نہیں لکھی، لیکن قاضی حمید الدین ناگوری کا سوز دروں ان کی تصانیف میں چمک اٹھا۔

قطب صاحبؒ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار خواجہ اجمیریؒ دہلی تشریف

لائے تو شیخ الاسلام دہلی نے شکایت کی کہ ان کی مقبولیت نے سارے چراغ بے نور کر دیے ہیں، خواجہ اجمیریؒ نے ان کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے کا فیصلہ کر لیا، جب یہ دونوں بزرگ روانہ ہوئے تو دہلی میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، میر خورد نے لکھا ہے:

"در تمام شہر دہلی شور افتاد، ہمہ	اس بات سے تمام شہر دہلی میں
اہل شہر مع سلطان شمس الدین	ایک شور برپا ہو گیا، تمام اہالیان
دنبال بر آمدند و ہر جا شیخ قطب الدین	شہر مع سلطان شمس الدین ان کے
قدم می گذاشت خلائق خاک آں	پیچھے روانہ ہوئے، جہاں شیخ
زمین بہ تبرک برمی داشت"	قطب الدین قدم رکھتے تھے لوگ
(سیر الاولیاء)	اس زمین کی خاک تبرک کے طور پر
	اٹھا کر رکھ لیتے تھے۔

خواجہ اجمیری نے جب سلطان اور عوام کو یکساں رنجیدہ پایا تو قطب صاحبؒ کو دہلی ہی میں قیام کا حکم دیا، اور خود اجمیر واپس ہو گئے، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ قطب صاحبؒ مقروض لوگوں اور لڑکیوں کی شادی کے لیے پریشان والدین کی خاص طور پر مدد کرتے تھے۔

قطب صاحبؒ خواجہ احمد جامؒ کے کلام سے بہت متاثر تھے، جام اوش سے کچھ فاصلہ پر تصوف کا اہم مرکز تھا، اس سے تھوڑی ہی دور چشت تھا، اس طرح تصوف کے سارے رجحانات جام پر اثر انداز ہوئے تھے، خواجہ احمد جامؒ اکبر کی ماں حمیدہ بانو کے جد اعلیٰ تھے، اور اکبر کا نام ان ہی کے روحانی اشارہ پر، جس کا ذکر گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں کیا ہے، رکھا گیا تھا، وحدت وجود

ان کے لیے ایک نظریہ نہیں بلکہ جذبہ تھا، قطب صاحبؒ نے شیخ علی سگزیؒ کی خانقاہ میں احمد جام کی یہ غزل سنی ؎

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

اس میں خود ان کو اپنی زندگی کی کیفیت نظر آگئی، چار رات دن کیف و وجد کا عالم طاری رہا، پھر جان جان آفریں کے سپرد کر دی، جامیؔ نے احمد جام سے ہی متاثر ہو کر کہا تھا ؎

یک بار میرد ہر کسے بیچارہ جامی بارہا

حسنؔ دہلوی نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اس زمین میں ایک غزل لکھی ہے جس کا ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے، دو شعر سنتے چلیے ؎

عالمے پر شد ز خاموشیٔ من بے زباناں را زبانے دیگر است

درد و راحت در جہاں بسیار بود درد تو راحت رسانے دیگر است

قطب صاحب کی زندگی اور ان کی موت تاریخ تصوف میں یادگار بن گئیں، اور عشق و آشفتگیٔ عشق کی مثال ان سے قائم ہوئی۔

قاضی حمید الدین ناگوریؒ اپنے علمی تبحر میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے تھے، تصوف کی مشہور کتاب روح الارواح ان کو ازبر یاد تھی، انھوں نے ہی دہلی میں اس کو رواج دیا، ان کی تصانیف لوائح اور طوالع الشموس بہت مقبول ہوئیں، ان کی تصنیفات کے متعلق شیخ نظام الدین اولیاء ایک بزرگ کا قول نقل فرمایا کرتے تھے کہ وہ علم و حکمت کا خزانہ ہیں، بابا فرید گنج شکرؒ سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی، ایک بار ان کو یہ رباعی لکھ کر بھیجی جس کو پڑھ کر ان پر ایک کیفیت طاری ہو گئی ؎

آں عقل کجا کہ در کمال تو رسد　　　آں روح کجا کہ در جلال تو رسد

گیرم کہ تو پردہ برگرفتی ز جمال　　　آں دیدہ کجا کہ در جمال تو رسد

شیخ نظام الدین ابوالمویدؒ تذکیر میں بے مثال تھے؛ ان تین بزرگوں نے دور اول میں عشق، علم اور تذکیر کے معیار قائم کیے اور تصوف کے تصورات کو اپنے مخصوص رجحانات کے ذریعہ کچھ اس انداز سے پھیلایا کہ طبیعتیں خود بخود اس کی طرف راغب ہوگئیں۔

بعد کو دہلی میں جن بزرگوں کو خصوصی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی ان میں شیخ نجیب الدین متوکلؒ، بی بی فاطمہ سامؒ اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے نام سر فہرست آتے ہیں۔ شیخ متوکلؒ، بابا فرید گنج شکر کے چھوٹے بھائی تھے، تقریباً ستر سال انھوں نے دہلی میں اس طرح گذارے تھے کہ کئی کئی دن پورا خاندان نان شبینہ سے محروم رہتا تھا، چھت پر کسی طرح ایک چھپر ڈال لیا تھا، جہاں وہ تنہائی میں عبادت کر لیتے تھے، جو شخص ان کی صحبت میں پہونچ جاتا، معرفت الٰہی کی جستجو اس کے پیکر خاکی میں بیدار ہو جاتی، شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے ان کی صحبت میں توکل، استغنا اور مجاہدہ کا سبق سیکھا، وفات کے بعد ان کو اسی مکان میں سپرد خاک کیا گیا، حبیب اللہ نے لکھا ہے:

"درختان آراک بانبوہ برمزار　　　مسواک کے درخت کثیر تعداد میں
متبرکہ اش سایہ افگن است"　　　ان کے مزار پر سایہ گستر ہیں۔

حضرت بی بی فاطمہ سامؒ بھی ایک جھونپڑے میں رہتی تھیں، ان کی ساری زندگی فقر و فاقہ میں گذری، ایک کنیز جس کو انھوں نے آزاد کر دیا تھا شام کو جو کی دو روٹیاں

اور پانی کا ایک کوزہ ان کے مصلے کے پاس رکھ جاتی تھی، لیکن ان کی دردمندی خلق اس کو گوارا نہیں کرتی تھی کہ پڑوس میں کوئی بھوکا موجود ہو، اور وہ اپنا پیٹ بھر لیں، فرمایا کرتی تھیں کہ بھوکے کا پیٹ بھرنا تو وہ روحانی سعادت ہے، جو لاکھوں روزوں اور نماز سے بھی میسر نہیں آسکتی۔

"بصد ہزار روزہ و نماز نتواں یافت"

بی بی فاطمہ شعر و ادب کا ذوق بھی رکھتی تھیں، بات بات میں شعر ان کی زبان پر آجاتا تھا۔

حضرت بی بی فاطمہ سامؒ اور حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے دہلی کی سرزمین میں تصوف کے اس بنیادی تصور کی آبیاری کی کہ حقیقی عبادت خدمت خلق کے مترادف ہے، مذہب کے اس انقلابی تصور کے امکانات کا احاطہ صرف وہ ذہن کر سکتا ہے جس نے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی زندگی کا مطالعہ ان کے سماجی اور دینی تصورات بالخصوص طاعت لازمی و طاعت متعدی کی روشنی میں کیا ہو، فرمایا کرتے تھے کہ طاعت لازمی سے مراد روزہ نماز اور دیگر عبادات ہیں، لیکن طاعت متعدی نام ہے مخلوق خدا کی مصیبت میں دستگیری اور دکھ درد میں شرکت کا، یہ فرق بیان کرنے کے بعد فرماتے تھے کہ طاعت متعدی کا ثواب، طاعت لازمی سے کہیں زیادہ ہے، شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے تصوف کو رسمی عبادات کے محدود دائرے سے نکال کر، انسانیت کی خدمت، اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے جہد و سعی کے وسیع میدان میں پہونچا دیا، ان کے مذہبی احساس و شعور کی پرورش اس بنیادی تصور کے گرد ہوئی تھی کہ اللہ کی ساری مخلوق بلا امتیاز مذہب و ملت ایک کنبہ ہے

اس کی فلاح و بہبود کے لیے جد وجہد تمام محدود نظریات اور تعصبات سے بالاتر ہو کر کرنی چاہیے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ وہ اکثر اپنی مجلسوں میں بیان فرمایا کرتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی کو شریک کیے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے، بعض اوقات مہمان کی تلاش میں میلوں نکل جاتے تھے، ایک دن ایک مشرک مہمان تھا، اس کو شریک طعام کرنے میں ان کو تامل ہوا، فوراً وحی الٰہی نازل ہوئی: "اے ابراہیم! ہم اس شخص کو جان دے سکتے ہیں اور تم روٹی نہیں دے سکتے"۔ ان کی تعلیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ربوبیت کے اوصاف اختیار کیے جائیں، شان ربوبیت یہ ہے کہ بادل جب پانی لے کر اٹھتے ہیں تو امیر و غریب، مسلم وغیر مسلم، سب کو فیضیاب کرتے گذر جاتے ہیں، سورج نکلتا ہے تو محل اور جھونپڑے میں فرق نہیں کرتا، سب کو یکساں روشنی اور گرمی پہونچا کر مغرب میں غائب ہو جاتا ہے، زمین کا دامن ہر ذی روح کے لیے یکساں کھلا رہتا ہے۔ انسان کو ربوبیت کے ان مظاہر سے اپنی فکر و کردار کی سمت متعین کرنی چاہیے، اور تخلقوا باخلاق اللہ پر عمل کرنا چاہیے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے نصف صدی سے زیادہ مخلوق کی دلداری کو عبادت کا درجہ دیا، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ دمشق میں ایک وقف تھا جو شکستہ دلوں کی مدد کے لیے تھا، حضرت محبوب الٰہیؒ کی ذات خود ایسا وقف بن گئی تھی جو رات دن قلوب انسانی کو راحت پہونچانے اور ان کے دکھ درد میں ساتھ دینے کے لیے وقف تھی، حضرت شیخ خود تو روزہ رکھتے تھے لیکن ان کے لنگر میں دن بھر کھانا تقسیم ہوتا رہتا تھا، سحری کے وقت جب خواجہ عبدالرحیم کھانے کے لیے کچھ پیش کرتے اور طبیعت کو مائل نہ پا کر اصرار کرتے تو فرماتے: کتنے لوگ ہیں جو دہلی میں مسجدوں کے گوشوں

اور دکانوں کے چبوتروں پر رات بھوکے سوئے ہیں، جب ان کا خیال آتا ہے تو یہ نوالے حلق میں اٹکنے لگتے ہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے تھے کہ اللہ تک پہونچنے کا راستہ اس کی مخلوق کی ہمدردی کے کوچے سے ہو کر گذرا ہے، جو اللہ سے محبت کرنا چاہے اس کی مخلوق سے محبت کرنا سیکھے، کوئی عبادت، کوئی ریاضت، کوئی مشقت قلوب انسانی کو راحت پہونچانے سے بڑھ کر نہیں ہے، انسان اس کرۂ ارضی پر اللہ کا خلیفہ ہے، اس کو خالق کائنات کی طرح اپنی شفقت و رافت کا سایہ ہر انسان پر بلا تفریق مذہب و ملت رکھنا چاہیے، فرمایا کرتے تھے کہ میں نے عالم بالا میں لکھا دیکھا ہے کہ انسانی قلوب کو راحت پہونچانے سے بہتر کوئی عبادت نہیں ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است   ز ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے محبوب الٰہیؒ کہلانے کی بنیاد یہ حدیث تھی:

الخلق عیال اللہ فاحب   خدا کی سب مخلوق اس کا کنبہ ہے
الخلق الی اللہ من احسن   اور وہ خدا کا سب سے زیادہ محبوب
الی عیالہ۔   ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ سب سے
زیادہ بھلائی کرتا ہے۔

فیروز شاہ تغلق نے سب سے پہلے ان کو "محبوب الٰہی" کے لقب سے یاد کیا ہے۔
حضرت محبوب الٰہیؒ انسانوں کو انسانیت کا احترام سکھانے کے لیے بے چین رہتے تھے، ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ "معاصی میان مرداں کم شدہ بود"۔ انھوں نے جذبۂ انتقام سے دلوں کو پاک کرنے کی تعلیم

دی، غصہ پی جانے کے بجائے معاف کرنے کو بہتر بتایا، بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی تلقین کی اور فرمایا کہ اگر کوئی تمہاری راہ میں ایک کانٹا رکھ دے، اور تم اس کے جواب میں ایک کانٹا اور رکھ دو تو زندگی میں کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے، وہ شیخ ابو سعید ابوالخیرؒ کی یہ رباعی اکثر اپنی مجلسوں میں پڑھا کرتے تھے :

هر که مارا یار نبود ایزد او را یار باد وانکه مارا رنجه دارد راحتش بسیار باد
هر که او در راه ما خارے نهد از دشمنی هر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

ایک دن صبح کے وقت اپنے جماعت خانہ کی چھت پر ٹہل رہے تھے، جمنا ان کی خانقاہ کا عکس اپنے سینے پر لیے دبے پاؤں برابر سے بہہ رہی تھی، نیچے نظر گئی تو دیکھا کہ ہندو اپنے بتوں کی پوجا میں مصروف ہیں، فرمایا : ؏

هر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس مصرع کی وسعتوں کو ذہن میں پھیلائیے تو اندازہ ہوگا کہ دہلی کی اس گنگا جمنی تہذیب کا عکس اس آئینہ میں اتر آیا ہے جس کے گرد دہلی کی مخصوص تہذیبی زندگی نے نشو و نما پائی تھی، خسرو کا یہ شعر اس فکر کی صدائے بازگشت ہے، یا یہ کہیے کہ تفسیر ہے ؎

اے کہ طعنہ زُبت بہ ہندو بری هم ز وے آموز پرستش گری

اس شعر کو اقبال رواداری کا بہترین مظہر سمجھتے تھے، اور خود ان کے اس شعر میں محبوب الٰہیؒ کے اس مصرع کی روح سمٹ آئی ہے ؎

ہے تو دامان باد اختلاط انگیز صبح شورش ناقوس، آواز اذاں سے ہمکنار

حضرت محبوب الٰہیؒ کی تعلیم پر اگر ہند کو آنے والی نسلوں نے عمل کیا ہوتا تو مذہبی رواداری اور انسان دوستی کی روایات ایک آفاقی نقطۂ نظر پیدا کر دیتیں۔

تصوف کا سارا تربیتی نظام بے اثر تھا، اگر اس میں خودی کی تعلیم کار فرما نہ ہو بقول اقبالؔ : ؎

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

امیر خسرو کے کلام کا اس نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ دہلی کے اکابر مشائخ نے اس خودی کی نگہبانی کس طرح کی تھی، انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

جانِ جہاں همه عالم توئی وانچه نگنجد بجهاں هم توئی
نورِ تو هنگامۂ انجم شکست دست تو تسبیح ملائک گسست

انسان کی نگاہ پاک اور مقاصد بلند ہونے چاہئیں، اس کو چاند میں اپنی گذرگاہیں تلاش کرنی چاہئیں، کہتے تھے ؏

مرتبہ بجو کہ برانی بماہ

جس نے ستاروں پر کمند نہیں ڈالی وہ تخلیق آدم کا مقصد نہیں سمجھا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے تصور خودی کو مستحکم کرنے میں خسرو کی مثنوی مطلع الانوار سے روشنی حاصل کی تھی۔

شیخ نظام الدین اولیاؒ کے زمانے میں شاید ہی دہلی کی کوئی اہم شخصیت ہو، عالم، شیخ، صوفی، مورخ، ادیب، شاعر، امیر، جو ان سے عقیدت و ارادت کا تعلق نہ رکھتا ہو، برنی نے ان کے زمانے میں غیاث پور کا نقشہ کھینچا ہے، کہ عقیدتمندوں کا ہجوم غیاث پور کی طرف ہر وقت دیکھا جا سکتا تھا، راستہ میں چھپر ڈال کر نماز کا انتظام کر دیا گیا تھا، جہاں مٹکے پانی سے بھرے ہوئے رکھے رہتے تھے، عقیدت مند والہانہ انداز میں غیاث پور کی طرف بڑھتے تھے، شاہ عبدالعزیزؒ تو یہ کہا کرتے تھے کہ

غیاث پور میں قدم رکھتے ہی آدمی کی حالت بدلنی شروع ہوجاتی تھی، ہندوؤں کو جو ان سے عقیدت تھی اس کی دو مثالیں شاید بے محل نہ ہوں، خاکسار کے پاس فوائد الفواد کا ایک قلمی نسخہ ہے جو ایک ہندو راجہ نے اس اعتقاد سے لکھوایا تھا کہ جو دل کی مراد ہو وہ کتابت کے دوران پوری ہوجاتی ہے، دوسرے لالہ چھجی لال جنھوں نے سیر الاولیاء وغیرہ شائع کی تھیں اپنے نام کے ساتھ بڑی عقیدت کے ساتھ "غیاث پوری" لکھا کرتے تھے۔

اس زمانے میں بعض دیگر سلاسل کے بزرگ بھی دہلی میں موجود تھے، جن میں شیخ نور الدین یار پرانؒ، شیخ ابو بکر طوسی حیدریؒ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، محمد بن تغلق نے جب مشائخ دہلی کو جبرًا دکن روانہ کیا تو دہلی میں تصوف کی روایات اور اس کے اداروں پر پژمردگی چھاگئی، صرف شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کی ذات تھی جو اس طوفانی دور میں عزم و ہمت کا ستون بنی اپنی جگہ قائم رہی، انھوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی روایات کی اس طرح پاسبانی کی کہ بقول مولانا حمید قلندر ان کی مجلس سے وہی خوشبو آتی تھی جو شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی مجلس میں، محمد بن تغلق امام ابن تیمیہؒ کے نظریات سے متاثر تھا، خانقہی نظام، صوفیانہ رسوم اور تصور ولایت کا سخت ناقد تھا، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے اس کو تصوف کی حقیقت سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن سودمند نہ ہوئی، شیخ نصیر الدین چراغ نے بعض تصورات کی اصلاح کی، اور یہ اعلان کرکے کہ:

"مشرب پیر حجت نمی شود، دلیل از کتاب و سنت می باید"

تصوف کی تحریک کو ایک زبردست Crisis سے بچالیا، انھوں نے ایک فکری انقلاب کا جو سلطان وقت کی سرگرمی میں بڑھتا آرہا تھا بڑی ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔

دہلی کے دو مشائخ جنھوں نے سلطان محمد بن تغلق کی مخالفت کی، شیخ صلاح الدین درویشؒ اور شیخ شہاب الدین حق گوؒ تھے، شیخ صلاح الدین کی "مناجات صلاح" ایک زمانے میں بہت مقبول تھی، شیخ شہاب الدین میرٹھ کے شاہ ولایت مولانا فخر الدین زاہدیؒ کے بیٹے تھے، انھوں نے محمد بن تغلق کو "عادل" کہنے سے انکار کیا، ان دونوں بزرگوں نے گو سلطان کی ہمنوائی سے انکار کیا لیکن حضرت چراغ دہلویؒ کی طرح فکری طور پر اس کا مقابلہ نہ کرسکے۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے بعد دہلی کی مرکزی حیثیت ختم ہوگئی اور جس طرح صوبوں میں خود مختار حکومتیں وجود میں آئیں اسی طرح مرکز سے بے تعلق خانقاہیں بھی قائم ہوگئیں، دہلی سے تصوف کا فکری سرمایہ دکن، بنگال، گجرات کو کثیر مقدار میں منتقل ہوا، اور بعض مقامی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر نہایت موثر انداز میں پیش کیا گیا، دکن میں جو تصوف کا لٹریچر وجود میں آیا وہ سب خواہ قوام العقائد ہو یا احسن الاقوال، نفائس الانفاس ہو یا شمائل الاتقیاء، نہ صرف دہلی کی روایات اس میں متحرک نظر آتی ہیں، بلکہ "یاد وطن" کے دلآویز جذبات بھی ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

پندرہویں[1] صدی میں دہلی میں مختلف خانوادوں کے بزرگ موجود تھے، اور اپنی اپنی جگہ تصوف کے افکار کی نشر و اشاعت میں مصروف تھے، لیکن ان میں

[1] یہ املا فاضل مقالہ نگار کا ہے، مروج پندرہویں، سولہویں، سترہویں وغیرہ ہے۔ (معارف)

کوئی "کل ہند" شخصیت موجود نہ تھی، اس زمانے میں شیخ سماء الدین سہروردی رح
اور ان کے مرید خاص شیخ فضل اللہ المعروف بہ درویش جمالی نے سہروردیہ سلسلہ
کو دہلی میں پھیلانے کی کوشش کی، جمالی نے اسلامی ممالک کا سفر بھی کیا اور وہاں سے
واپسی پر سیر العارفین مرتب کی، سیر العارفین جامی رح کی نفحات الانس کی صدائے
بازگشت ہے، جمالی ہرات میں مولانا جامی رح کی مجلس میں پہونچے تو جسم پر کپڑا نہ تھا،
سر سے پیر تک گرد آلود، چہرہ پریشان حال جامی کی مجلس میں پہونچے، جو نفاست،
صفائی اور باقاعدگی میں مشہور تھی، اور ان کے قریب بیٹھ گئے، جامی رح نے تعجب
اور یک گونہ ناراضگی سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟
عرض کیا ہندوستان سے، پوچھا: جمالی سے واقف ہو؟ جمالی کی آنکھوں سے
بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ اور نہایت درد کے ساتھ یہ شعر پڑھا ؎

مارا نہ خاک کویت پیراہن است بر تن — آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

جمالی جب یہ شعر پڑھ رہے تھے تو آنسو ان کے جسم پر بہہ کر گرد کو چاک کر رہے
تھے، جامی بے اختیار لپٹ گئے، یہ پہلا موقع تھا جب دہلی اور ہرات میں تصوف کی فکر
ملی اور ہندوستان میں حالات مشائخ کی ترتیب و تدوین کا نیا دور شروع ہوا، جمالی
نے ہندوستان کے تمام تذکرہ نویسوں کو جنھوں نے آیندہ صدی میں کتابیں لکھیں متاثر
کیا، گو شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے اصول اسناد کو پیش نظر رکھ کر اخبار الاخیار کو دوسرے
انداز میں ترتیب دیا، لیکن بہرحال جمالی اس راہ پر پہلے چلے تھے، گلزار ابرار، سیر الاقطاب،
اخبار الاصفیاء، سب نے اس سے فائدہ اٹھایا اور صوفیہ کے تذکروں کی ترتیب
میں سیر الاولیاء سے جو روایت قائم ہوئی تھی اس کو تقویت حاصل ہوتی رہی۔

اکبر کا بالکل آخری دور تھا جب حضرت خواجہ باقی باللہ رح کابل سے دہلی پہونچے،
ان کا انتقال صرف چالیس ۴۰ برس کی عمر میں ہوا، اور دہلی میں کام کرنے کا وقت بھی کم
ملا، لیکن ان کی شخصیت میں عجیب کشش اور ان کے اخلاق میں غیر معمولی دلنوازی
تھی کہ جو ان کے قریب پہونچ جاتا ان ہی کا ہو جاتا، صوفیہ، علماء، امراء سب یکساں
عقیدت کے ساتھ ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہوگئے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح،
نواب مرتضیٰ خان، شیخ فرید، عبدالرحیم خان خاناں ان کے معتقد اور ارادت مند تھے،
عشق الٰہی میں ان کے استغراق کا ترجمان ان کا یہ شعر ہے ؎

دریا دریا اگر بکامت ریزند — گم باید کرد و خشک لب باید بود

ایک مرتبہ لاہور گئے، وہاں قحط سالی کا دور تھا، انھوں نے کئی دن تک کھانا نہیں
کھایا، جب بھی کھانا سامنے لایا جاتا، کہتے:

"انصاف سے بعید ہے کہ کوئی بھوکا پیاسا گلی کوچوں میں جان دے اور
ہم کھانا کھائیں۔"

اور سارا کھانا بھوکوں کو بھجوا دیتے، ان کی سیرت میں حلم، دلنوازی اور انسان دوستی
کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی، فرمایا کرتے تھے کہ سلوک کا حاصل "تہذیب اخلاق" ہے،
کبھی سختی سے امر معروف نہ کرتے تھے، فرماتے تھے کہ امر معروف عالموں اور محتسبوں
کا کام ہے، ان کا انداز اتنا مشفقانہ اور طرز اتنا دلکش تھا کہ لوگوں پر ان کی تعلیم
اثر کیے بغیر نہ رہتی تھی، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ساری جدوجہد کا اصلی مقصود
آدمی کو "آدمی" بنانا ہے، ان کی زندگی زبان حال سے پکارتی تھی ؎

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے — یہ آدم گری ہے، وہ آئینہ سازی

ان کے خلفاء میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ تھے، جنھوں نے نقشبندی سلسلہ کی نشر و اشاعت میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے اور ان کے مریدین' جیسا کہ جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے' ہر شہر اور دیار میں پہونچ گئے، خواجہ باقی باللہ کے زیر اثر دہلی نقشبندی سلسلہ کا ایسا مرکز بنی کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، شاہ ولی اللہ، مرزا مظہر جان جاناںؒ اور شاہ غلام علیؒ کی سرگرمیوں نے یہاں کی فضا بدل دی، دورِ سلطنت کی دلی پر اگر چشتیہ سلسلہ کا رنگ غالب تھا تو عہد مغلیہ میں نقشبندی سلسلہ یہاں کی روحانی زندگی کا مرکز و محور تھا، انڈیا آفس کے کتب خانہ میں Delhi Collection (جو ان مخطوطات پر مشتمل ہے جو لال قلعہ سے منتقل کیے گئے تھے) بیشتر کتابیں نقشبندی سلسلہ سے متعلق ہیں.........، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلعہ تک یہ اثرات کام کر رہے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا حقیقی مقام تو بحیثیت محدثین اور علمائے دین ہے، لیکن دہلی میں تصوف کے نشو و نما کی کوئی تاریخ ان کے افکار و اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتی، دونوں نے علم حدیث کی آبیاری کی، اور شریعت اور طریقت کے درمیان خلیج کو پُر کیا، شاہ ولی اللہؒ نے قرآن پاک کا ترجمہ کر کے مذہبی احساس و شعور کو ایک نیا رُخ دیا، اور مجتہدانہ فکر کے دروازے کھول دیے، تصوف کی جو کتابیں ان دونوں نے خود لکھی ہیں یا ان کے زیر اثر لکھی گئی ہیں' ان میں تصوف "احسان" کی شکل میں نمودار ہوا ہے، اس طرح تصوف کی بنیادی حیثیت بہت مضبوط ہو گئی، اور صوفیہ اور علماء کے درمیان جو فکری خلیج تھی اس کے پُر ہونے کا سامان مہیا ہو گیا۔

شیخ عبدالحق محدث کے چچا شیخ رزق اللہ مشتاقیؒ فارسی اور ہندی دونوں میں شعر کہتے تھے، ہندی میں راجن اور فارسی میں مشتاقی تخلص تھا، صبح گلشن میں ان کے متعلق لکھا ہے:

"در کتب علمیہ ہنداں مہارتے کامل داشت۔"

ہندو علوم میں دستگاہ کی جس روایت کو مشتاقیؒ نے تقویت پہونچائی وہ بنیادی طور پر وہی تھی جس کو امیر خسروؒ نے رواج دیا تھا اور کہا تھا ؎

من تندری برسر ایں کار شدم — در دل شاں محرم اسرار شدم

اس کا نقطۂ عروج مرزا مظہر جان جاناں کے نظریات تھے جنھوں نے فکر و نظر کی ایک نئی دنیا پیدا کر دی تھی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار، شرح فتوح الغیب، ترجمہ غنیۃ الطالبین مرج البحرین وغیرہ لکھ کر سلوک و معرفت کی راہوں میں چراغ جلائے، حبیب اللہ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب شاہ جہاں کو تخت سلطنت پر بٹھایا گیا تو ایک ہاتھ شیخ عبدالحقؒ پکڑے ہوئے تھے اور دوسرا سید محمد قنوجیؒ۔

سترویں صدی کی دلی میں گو فقہی دلچسپیوں نے دیگر علوم کی دنیا سونی کر دی تھی، لیکن بعض صوفی بزرگ اس زمانہ میں بھی اپنی بساط پورے اعتماد کے ساتھ بچھائے ہوئے تھے، اور ارشاد و تلقین کے کام میں مصروف تھے، اورنگ زیب نے فقہ عالمگیری کی تدوین کرائی تھی اور وہ فقہ کا بے حد احترام کرتا تھا، اس کے ایک معاصر صوفی شیخ بانہ یداللہؒ نے ایک فقہی مسئلہ میں اس کا سر نیچا کر دیا، حبیب اللہ کا بیان ہے کہ ایک دن وہ عالمگیر سے بولے:

تو کہ نائبِ پیغمبری، چرا سنت — تو نائب پیغمبر ہے، سنت رسولؐ کا

او بجا نمی آری و دختراں را — اتباع کیوں نہیں کرتا، اور اپنی

کد خدا نمی سازی؟ — لڑکیوں کی شادی نہیں کرتا؟

عالمگیر کے پاس اس کا جواب نہ تھا، اس نے لڑکیوں کی شادیاں کردیں" حالانکہ ایں کار ازینہا کمتر بوقوع آمدہ"۔

شیخ بایزید اللہ ہوؒ کی شخصیت بھی بعض اعتبار سے بڑی دلکش تھی، اکثر ننگے سر اور ننگے پیر رہتے تھے، ایک سرخ چادر لپٹی رہتی تھی، ایک دن بیرم بازار سے گذر رہے تھے، ایک عورت کو دیکھا، شدید امراض میں مبتلا، بدحال اور پریشان، رُکے اور اس سے پوچھا: تیرا کوئی والی ہے؟ جواب ملا: نہیں! غیر از خدا ہیچ کس ندارم، کہا: اگر میرے نکاح میں آجاؤ تو علاج کرادوں، اس نے اقرار کیا، نکاح کر کے گھر لے آئے، اس کے زخموں کو خود پابندی سے دھوتے اور اس کا علاج معالجہ کرتے، جب وہ عورت صحتیاب ہوگئی تو اس کا مہر ادا کیا اور طلاق دے دی، حبیب اللہ نے ان کے مزار کے متعلق لکھا ہے:

"نزدیک نخاس شاہ جہاں آباد قریب باغات وانہار سرراہ شاد ہو رہ مدفون گشت"۔

اسی زمانہ کی ایک اور دلچسپ شخصیت سرمد کی تھی، ان پر جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی، برنیر نے ان کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں کیا، اور ان کے برہنہ رہنے پر اعتراض کیا ہے، ان کی فکر آزاد تھی اور باقاعدہ تصوف کے نظام یا فکر سے بھی کوئی تعلق نہ تھا، لیکن انداز بہت دلکش تھے، ایک دن جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سرخوش، ناصر علی سرہندی اور بیدل بیٹھے شعر و سخن پر گفتگو کر رہے تھے، اتنے میں سرمد ادھر آنکلے، دیکھ کر مسکرائے

اور یہ شعر پڑھ کر آگے بڑھ گئے ؎

دیر است کہ افسانۂ منصور کہن شد — اکنوں سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

تقدیر کھڑی مسکرا رہی تھی کہ یہی انجام تیرا منتظر ہے۔

اٹھارویں صدی میں زوال و انحطاط کے بادل گھر گھر کر آرہے تھے اور بقول میر ؎

قبائے لالہ و گل میں جھلک رہی تھی خزاں — بھری بہار میں رویا کیے بہار کو ہم

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں ایسے مشائخ اور اکابر صوفیہ دہلی کی مسندوں پر نظر آتے تھے جن کے علمی تبحر، روحانی بصیرت، ادیبانہ ذوق، عمرانی فکر اور سماجی بیداری کی دوسری مثال نہیں ملتی، شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ، مرزا مظہر جان جاناںؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، خواجہ میر درد، اور شاہ فخر الدین دہلویؒ اس عہد کی وہ شخصیتیں ہیں جن کے وجود نے دلی کا سر سیاسی انحطاط کے دور میں اونچا رکھا، علمی اور روحانی صلاحیتوں کا یہ اجتماع پھر کبھی دلی کو میسر نہیں آیا، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے متعلق تو مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ان کی نواسنجیوں کے آگے غزالیؒ، رازیؒ اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے تھے، ان کی حجۃ اللہ البالغہ میں آنے والے دور کے خدوخال صاف نظر آتے تھے۔

شاہ کلیم اللہؒ کے بزرگ فن تعمیر کے ماہر تھے، لال قلعہ اور جامع مسجد ان کے تعمیری کارنامے ہیں، لیکن شاہ کلیم اللہؒ کو بقول آزاد بلگرامی اللہ تعالیٰ نے دلوں کی معماری پر مامور کیا تھا، انھوں نے چشتیہ سلسلہ کے مرکزی نظام کو جو حضرت چراغ دہلویؒ کے بعد کمزور پڑ گیا تھا، نئی زندگی بخشی اور ان کا نظام اصلاح و تربیت دکن تک کام کرنے لگا، انھوں نے عشرۂ کاملہ، سواء السبیل، کشکول، مرقع، تسنیم وغیرہ لکھ کر تصوف کے مرکزی

تصورات کو نئے انداز میں پیش کیا، ان کی تصانیف مدتوں چشتی حلقوں میں مقبول رہیں، ان کی دینی فکر کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ وہ روحانی تربیت کے لیے مرید کی مادری زبان کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے، سند میں بابا فرید گنج شکرؒ کی روش بیان کرتے تھے کہ وہ پنجابی زبان میں ذکر کو ترجیح دیتے تھے۔

شاہ فخرالدین دہلویؒ، شاہ کلیم اللہؒ کے مرید شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے اور ایک روحانی اشارہ پر اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں آکر اقامت گزین ہوگئے تھے، انھوں نے چشتیہ سلسلہ کی شاخیں دور دور قائم کیں، وہ خود مدرسہ میں حدیث کا درس دیتے تھے اور مسلکین سلسلہ کی روحانی تربیت میں اپنا وقت صرف کرتے تھے، دہلی میں ان کی عزت اور احترام کا یہ حال تھا کہ جب شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا انتقال ہوا اور شاہ عبدالعزیزؒ کو ان کی مسند درس پر بٹھلانے لگے تو سب کی نظریں شاہ فخرالدینؒ کی طرف اٹھیں، اور انھوں نے سر پر دستار فضیلت باندھی۔

سلاطین مغلیہ کو شاہ فخر صاحبؒ سے بڑی عقیدت تھی، بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے ؎

اے ظفر کیا بتاؤں تجھ سے کہ جو کچھ ہوں سو ہوں ؛ لیکن اپنے فخر دیں کے کفش برداروں میں ہوں

کالے صاحب جن سے غالب کو بڑا تعلق خاطر تھا، شاہ فخر صاحب کے پوتے تھے، پنجاب اور دکن میں چشتی خانقاہیں ان ہی کی جدوجہد سے وجود میں آئیں، خدمت خلق کے جذبہ کا یہ عالم تھا کہ حج کے لیے روانہ ہوئے، جہاز پر سوار ہونے لگے تو ایک بڑھیا آگے بڑھی اور عرض کیا: مجھے لڑکی کی شادی کرنی ہے اور حال یہ ہے کہ گھر میں فاقے ہوتے ہیں، یہ کام کیسے انجام دوں، شاہ فخر صاحبؒ نے فوراً اپنا سامان اتار لیا،

اور جو کچھ زاد راہ تھا اس بڑھیا کے حوالے کر کے دہلی واپس آگئے۔

خواجہ میر دردؔ (۱۷۲۰ - ۱۷۸۴ء) جام معرفت سے سرشار، تصوف کے مسلم الثبوت استاد تھے، ان کا حقیقی مقام تصوف تھا، شاعری نہیں، ان کی شاعری میں تصوف کا سرجوش ملتا ہے، فن موسیقی کے ماہر تھے، اپنے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب کے سجادہ پر بیٹھ کر تصوف کا رنگ بہت گہرا اور والہانہ ہوگیا تھا، انھوں نے اپنے شعروں میں بقول صاحب آب حیات "تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے"، ان کا علمی شاہکار "علم الکتاب" ہے، جس میں تصوف کے بنیادی افکار، سلسلۂ نقشبندیہ کی مرکزی حیثیت، وحدت الوجود، وحدت الشہود وغیرہ مباحث پر جس انداز سے گفتگو کی ہے، وہ دہلی میں لکھی گئی کسی کتاب میں نہیں ملتی، اس میں تشریح ہے ان کے اس شعر کی ؎

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

مرزا مظہر جان جاناںؒ اپنے زمانے میں نقشبندیہ سلسلہ کے سب سے مشہور اور مقبول بزرگ تھے، ان کے فارسی اشعار میں جذبات و احساسات کی ایک دنیا سمٹ آئی ہے، ان کے "خریطہ جواہر" نے، جس میں انھوں نے فارسی اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے، بقول غالب، ہندوستان میں فارسی شاعری کا ذوق زندہ کیا، وہ سید نور محمد بدایونیؒ کے حلقہ مریدین میں شامل تھے، اور مدتوں ان کے آستانے سے وابستہ رہے تھے، پھر تقریباً ۳۵ سال مسند ارشاد و تربیت کو رونق بخشی، نعیم اللہ بہرائچی کا بیان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ تقریباً سو طالبان حق کو توجہ نہ دیتے ہوں، دہلی اور روہیل کھنڈ میں ان کے مریدین کی کثیر تعداد تھی، بیرونی

حملوں اور اندرونی بدامنی نے ان کو پریشان کر دیا تھا، لیکن ان کے اصلاحی پروگرام میں کبھی فرق نہ آیا، ان کی وسیع مشربی کا یہ حال تھا کہ بڑی تعداد میں ہندو ان کے معتقد تھے، آخر عمر میں وہ اپنے ایک ہندو معتقد رام کیول کے مکان میں رہنے لگے تھے، وہ وید کو الہامی کتاب مانتے تھے اور جن اکابر کا اس میں ذکر ہے ان کو پیغمبر تسلیم کرتے تھے، انھوں نے اپنی وسیع المشربی سے ہندو مسلم ارتباط کو مضبوط کرنے کے لیے سماجی، جذباتی اور فکری تینوں قوتوں کا استعمال کیا، مزاج بے حد نازک تھا، اتنا نازک کہ بے اختیار مولانا اقبال سہیل کا یہ مصرع زبان پر آجاتے ہے ع

نازک ہے مزاج حسن بہت، سجدوں سے بھی برہم ہوتا ہے

مزاج کے خلاف کوئی بات ہوتی تو مغل بادشاہ پر بھی غصہ کا اظہار کر دیتے، رضائی میں ٹیڑھے ڈورے پڑ جاتے تو رات بھر جاگ کر گذار دیتے، پانی پی کر کوئی کٹورا ٹیڑھا رکھ دیتا تو سر میں درد ہو جاتا، اسی نازک مزاجی کی پیداوار وہ جذبہ تھا جو انسانی رشتوں میں کسی طرح کی بدمزگی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، انھوں نے ہندو مسلمانوں کو قریب لانے کے لیے صرف وید کو الہامی کتاب ہی قرار نہیں دیا بلکہ ان کی بہت سی رسوم کی بھی ایسی توجیہ کی، جن سے اعتراضات کا وزن کم ہو گیا، انیسویں صدی میں ان کے خلیفہ حضرت شاہ غلام علیؒ کی خانقاہ اس زمانے کی سب سے مشہور و معروف خانقاہ تھی، ان کے ایک ہزار کے قریب خلیفہ اور لاکھوں مرید تھے، اور مرید بھی اس مرتبے کے کہ ان کی علمیت اور بزرگی کا شہرہ مصر و شام تک پھیلا ہوا تھا، سرسید کا بیان ہے:

"میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم و شام اور بغداد و مصر و چین

اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے، اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان، پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امڈے تھے"

ان کے ایک مشہور خلیفہ مولانا خالد کردی تھے، ان کا مزار دمشق میں مرجع خلائق ہے، ایک قصیدہ میں وہ اپنے مرشد کے متعلق لکھتے ہیں ؎

امام اولیاء، سیاحِ بیدائے خدا بینی — ندیم کبریا سیاحِ دریائے خدا دانی
امن قدس عبد اللہ کز التفات او — دہد سنگ سیہ خاصیت لعل بدخشانی

ان کے بعد شاہ ابو سعیدؒ، شاہ احمد سعیدؒ نے ان کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھا، انگریزوں کی مخالفت کا یہ عالم تھا کہ سرسید نے جو شاہ غلام علیؒ کے مرید تھے انگریزی ملازمت اختیار کرنے کے بعد جب نذر پیش کی تو قبول کرنے سے انکار کر دیا،

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رستاخیز نے اس بزم کو اس طرح برہم کیا کہ ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
داماں باغبان و کف گلفروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

التمش کی بنائی ہوئی دلی اور اس کے اکابر صوفیہ کی روایات تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں دور غائب ہو گئیں۔

قدسی الٰہ آبادی اور نعت قدسی

از جناب کالی داس گپتا رضا بمبئی

(سلسلے کے لیے دیکھئے معارف ماہ اکتوبر ۱۹۹۰ء)

حصہ دوم

ڈاکٹر محمد انصار اللہ اپنے مضمون مطبوعہ 'نیا دور' بابت ستمبر ۱۹۸۹ء میں لکھتے ہیں:

"قدسی کی مذکورہ نعت کو جو قبول عام حاصل ہوا، اس نے تحسین کو بھی متوجہ کیا۔ اور جناب کالی داس گپتا رضا کے قول کے مطابق اس نے پہلی بار "خمسہائے غزل قدسی یا مدح نبی" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کر کے اپنے مطبع سے شایع کر دیا۔ اس مجموعے کا ایک نسخہ جناب رضا کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے اور اس کے آخر میں رضا صاحب کے بیان کے مطابق ۱۲۶۹ھ، ۱۲۷۰ھ اور ۱۲۷۱ھ کے قطعات تاریخ شامل ہیں۔ ان قطعات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مجموعہ مرتب کرنے کا خیال تحسین کو ۱۲۶۹ھ میں ہوا تھا۔ اور دو برس بعد اس مجموعے کی طباعت کا کام مکمل ہوا۔ اس مجموعے کے آخر میں تحسین کا کہا ہوا ایک قطعہ "در ذکر شعراء" ہے۔ جس میں بہ شمول مرتب ایک سو سات شاعروں کا ذکر ہوا ہے۔ جناب رضا نے ان شاعروں کی فہرست تو نہیں دی ہے لیکن ان کے اور ڈاکٹر سمیع الدین صاحب کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اکثریت ان کی تھی

جو دہلی کے رہنے والے تھے یا دہلی میں آکر رہنے لگے تھے۔ مثلاً ظفر، غالب، تحسین، نازنین وغیرہ۔ تحسین کے مجموعے نے تحریک کی اور ایک برس بعد قاضی محمد عمر نامی ایک شخص نے قدسی کی نعت کے خمسوں پر مشتمل ایک دوسرا مجموعہ "حدیث قدسی" کے نام سے مرتب کیا جو مطبع مصطفائی' کانپور میں باہتمام بدیع الزماں چھپ کر شایع ہوا قاضی محمد عمر کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ البتہ 'حدیث قدسی' کے آخر میں شامل قطعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی شاعر تھے اور قاضی تخلص کرتے تھے۔ سید شمشیر علی مرتب صحیفۂ قدسی کا کہنا ہے کہ "میری نظر سے حدیث قدسی" گذری جو ۱۲۷۳ھ میں قاضی محمد عمر صاحب نے جمع کر کے چھپوائی تھی"۔ لیکن جناب کالی داس گپتا رضا کا دعویٰ ہے کہ اس کا "۱۲۷۳ھ میں چھپنا قرین قیاس نہیں کیونکہ یہ رسالہ "خمسہائے غزل قدسی از تحسین ہی کی نقل ہے"۔ اگر قاضی کا مجموعہ تحسین کے مجموعے کی نقل ہو تو بھی ۱۲۷۳ھ میں 'حدیث قدسی' کا چھپ جانا قرین قیاس کیوں نہیں ہے۔ یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے۔ خصوصاً جبکہ ایک دیکھنے والا اس بات کا شاہد بھی ہے۔ دراصل جناب رضا "قاضی کو سارق ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ یہ جانتے ہوئے کہ 'حدیث قدسی' کے متعدد ایڈیشن نکلے تھے، ایک عینی شاہد کے بیان کو بھی خلاف قیاس ٹھہرانا ضروری سمجھتے ہیں۔ قاضی کی کتاب "حدیث قدسی" کے آخر میں "غزل از فکر ناقص قاضی محمد عمر مولف مجموعۂ ہذا در ذکر شعراء" بھی شامل ہے۔ اس غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرا کی تعداد ایک سو انیس ہے۔ ڈاکٹر سمیع الدین صاحب نے اس غزل کو اپنی کتاب میں نقل کرنے کے ساتھ شاعروں کے ناموں کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ جناب کالی داس گپتا رضا کا دعویٰ ہے کہ قاضی صاحب نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں بڑھایا'

لیکن ڈاکٹر سمیع الدین صاحب کی فراہم کردہ اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ "حدیث قدسی" میں خمسوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ قاضی پر سرقے کا الزام لگانے والے کے لیے لازم تھا کہ وہ دونوں مجموعوں کا تفصیلی مقابلہ بھی کرتا۔ قاضی کا مرتب کردہ مجموعہ "حدیث قدسی" بہت مقبول ہوا۔ خود جناب کالی داس کا کہنا ہے کہ ان کے کتب خانے میں اس کے تین ایڈیشن موجود ہیں۔ امکان ہے کہ اور بھی ہوں"۔ حدیث قدسی" سے متاثر ہو کر حاجی شمشیر علی ولد میر عزیز اللہ صاحب ساکن گوہانہ، ضلع رہتک (مقیم دہلی) نے بھی ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) میں قدسی کی مذکورہ نعت کی تضمینوں کا ایک مجموعہ "صحیفۂ قدسی" کے نام سے مرتب کر کے محمود المطابع، دہلی سے چھپوایا۔ اس مجموعے میں شاعروں کی کل تعداد ایک سو اکیاون [۱۵۱] ہے۔ حاجی شمشیر علی نے قاضی محمد عمر کے مجموعے کی اہمیت کے اعتراف میں خود اپنے مجموعے کو "حدیث قدسی کا حصہ دوم" قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر سمیع الدین صاحب نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "حقیقتاً مجموعہ صحیفۂ قدسی، حدیث قدسی کا حصہ دوم نہیں ہے لیکن محض اس بنا پر کہ یہ نسخہ موخر تھا اور حدیث قدسی کے بعد تیار کیا گیا تھا، مرتب نے اس کو یہ نام دے دیا ہے۔ ورنہ حقیقتاً دونوں الگ اور جداگانہ کوششیں ہیں"۔ لیکن جناب کالی داس صحیفۂ قدسی کی ترتیب کو بھی "بڑی چوری" بتلاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو مطلوب ہے۔ ....

جتنے مجموعے موصوف کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان سب کو تو انھوں نے دیکھ ہی لیا ہو گا۔ ان سینکڑوں خمسوں کے عنوانوں میں موصوف کو براہ راست تو کیا بالواسطہ بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں مل سکا جو اس نعت کے مصنف کو قدسی مشہدی ثابت

کرتا ہو۔ اتنی بات بھی اس حقیقت کے اعتراف کے لیے کافی تھی کہ قدسی مشہدی سے اس نعت کا کوئی تعلق نہیں ہے"۔

مجھے حیرت ہے کہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے تحقیقی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر محض مجھے موردِ الزام ٹھہرانے ہی کو افضل سمجھا۔ انھوں نے جو باتیں بھی میرے خلاف کہی ہیں ان سب کا دافر جواب میرے مضامینِ مطبوعہ میں موجود ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان مفاہیم کو دوبارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ بات از خود واضح ہو جائے گی۔ ملاحظہ کیجیے۔

"آج کل" کے ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء کے شمارے میں ص ۹ پر ایک مضمون بعنوان "دلی کے ایک اہم نعتیہ مشاعرے کی تضمین"[۱] شایع ہوا تھا جو سید وزیر الحسن کے قلم سے نکلا تھا۔ سید صاحب "شاہجہانی دربار کے ملک الشعراء قدسی"[۲] کی نعتیہ[۳] غزل اور سینکڑوں تضمینوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

"مجھے اس سلسلے میں ان تضمینوں کے صرف ایک مجموعے کا ذکر کرنا ہے جسے قاضی محمد عمر ساکن دہلی نے ۱۸۵۶ء کے اواخر میں "حدیث قدسی" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مگر اس کی طباعت ایک مدت بعد [۱۸۶۳ء میں] ہوئی۔ یہ مجموعہ دلی کے ایک نعتیہ مشاعرے کا گلدستہ ہے جو ۱۸۵۷ء (۱۸۵۶ء) کے ہنگامے سے پہلے کا غالباً آخری نعتیہ مشاعرہ تھا"۔

ان تضمینوں میں غالب کی تضمین بھی شامل ہے جو ان کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کلام میں

۱؎ یہی مضمون "ہما" کے "غالب نمبر" ۱۹۶۹ء میں دوبارہ چھپا ہے۔ ۲؎ قدسی المتوفی ۱۰۵۶ھ ۳؎ مطلع یہ ہے :

مرحبا سید مکی مدنی العربی دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اکرام الحق (شعر العجم فی الہند؛ مطبوعہ ۱۹۶۱ء ص ۱۳۰) نے بھی غلطیا یہ جو اس مطلع کو اسی قدسی سے منسوب کیا ہے۔

شامل نہیں۔ البتہ "سبد باغ دو در[1]" اور بیاض زحمت[2]" میں موجود ہے۔ غالب کی تضمین کو اس مجموعے "حدیث قدسی" میں پاکر سید صاحب بے اختیار کہہ اٹھے :

"تضمین غالب کے ادبی آثار میں ایک نادر چیز ہے ....

...... ان کی فنی غیرت نے کبھی گوارہ نہیں کیا کہ وہ .... کسی کے کلام پر تضمین کریں ...... اور ادبی طفیلیہ ہونا ان کی اجتہادی شان کے خلاف تھا۔

..... تضمین مستقل نظم کی حیثیت سے غالب کے فن سخن میں گویا صنف ممنوعہ ہے

انھوں نے صرف نعت گوئی کے لیے اپنا یہ اصول توڑا ہے"۔

وزیر الحسن صاحب کے اوپر دیے ہوئے اقتباسات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں :-

(اول) دلی میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ ہی مدت پہلے ایک نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں اس وقت کے مشاہیر شعراء نے "ملک الشعراء قدسی" کی مشہور نعتیہ غزل پر تضمینیں پڑھی تھیں اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پہلے کا غالباً

۱؎ یہ غالب کی فارسی نظم و نثر کا ذخیرہ ہے۔ اسکی کتابت طباعت کی غرض سے غالب کی زندگی میں ۸۳-۱۲۸۲ھ (۶۶-۱۸۶۵ء) میں شروع ہوئی تھی مگر مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد، ربیع الآخر ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) کو ختم ہوئی اور ۱۹۵۹ء تک اسکے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ "سبد باغ دو در" غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے۔ کاتب یہ نسخہ (مملوکہ سید وزیر الحسن) غالب کے شاگرد منشی ہیرا سنگھ کھتری کی فرمائش پر لکھا تھا، جو حوض قاضی کے قریب گندی گلی میں رہتے تھے۔ قیاس ہے کہ اسکا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گذرا ہے۔ اسے وزیر الحسن صاحب نے اورینٹل کالج میگزین لاہور اگست ۱۹۶۰ء اور اگست ۱۹۶۱ء میں طبع کرا دیا تھا اور اب کتابی صورت میں بھی یکجا کر دیا ہے۔ ۲؎ عہد غالب کی قلمی بیاض۔

یہ آخری نعتیہ مشاعرہ تھا

(دوم) ان تمام تضمینوں کو قاضی محمد عمر ساکن دہلی نے ۱۸۵۶ء کے اواخر میں ایک گلدستے کی شکل دے کر "حدیث قدسی کے نام سے مرتب کر دیا تھا۔ جس کی طباعت ایک مدت بعد ہوئی۔ غالب کبھی تضمین نہیں کرتے تھے، یہ اصول

(سوم) انھوں نے صرف نعت گوئی کے لیے توڑا ہے۔

جس وثوق سے وزیر الحسن صاحب نے یہ سب کچھ کہہ دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہر لفظ حقیقت ہے اور ان سے اختلاف کی ذرہ بھر گنجائش نہیں، حالانکہ جائے اختلاف اتنی عریض ہے کہ اسے پاٹا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ نہ اس مفروضہ نعتیہ مشاعرے کا انعقاد ہی کبھی ہوا نہ قاضی محمد عمر صاحب حدیث قدسی کے اولین مرتب ہی رہیں۔

محمد حسین خاں تحسین[1] جو اس عہد میں مطبع مصطفائی، دہلی کے مالک اور مہتمم تھے اور اچھے شاعر تھے، انھوں نے کسی مشاعرے کی غرض سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ "بعد چھوڑ جانے اس دار فانی کے واسطۂ بقائے نام اور وسیلہ نیکی سرانجام کا ہو" اس وقت کے نامی گرامی شعرائے ہند سے کچھ ذاتی تعارف کی بنا پر اور کچھ بذریعہ خط و

۱؎ (۱) ...... مالک مطبع مصطفائی دہلی۔ غدر سے پہلے انکا چھاپہ خانہ دہلی میں بہت مشہور تھا۔ غدر کے بعد میرٹھ میں مطبع احمدی جاری کیا۔ فن سخن میں حضرت ذوق سے فیض پایا تھا، نہایت خلیق، با مروت اور کارگذار شخص تھے۔ انکے مطبع کی کتابیں نہایت شوق سے خریدی جاتی تھیں......" خم خانۂ جاوید۔ جلد دوم ص ۴۵

(ب) غالب نے اپنے دیوان کا ایک ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں انہیں محمد حسین خاں تحسین سے چھپوایا تھا جو بعد تصحیح دوبارہ مطبع نظامی میں چھپا۔ ۱۲۷۹ھ (۶۳-۱۸۶۲ء) میں دیوان ذوق پر بھی تحسین کی عبارت درج ہے۔ سفرنامہ شیفتہ "رہ آورد" بھی تحسین ہی کے اہتمام سے مطبع مصطفائی سے ۲۲ رجب ۱۲۸۳ھ (یکم دسمبر ۱۸۶۶ء) کو چھپا تھا۔ گویا اسوقت تحسین زندہ تھے۔

کتابت قدسی کی مشہور نعتیہ غزل پر تضمینیں کرا کے ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں ایک کتاب ترتیب دی اور اس کا نام بہ رعایت مضامین رنگین "چمن مدح نبیؐ" رکھا۔ اس کام میں انھیں دو سال لگے اور طباعت میں مزید دو سال کا عرصہ صرف ہوا یعنی ۳؍ صفر ۱۲۷۱ھ (۲۶؍ اکتوبر ۱۸۵۴ء) کو یہ کتاب "مجموعۂ خمسہ ہائے غزل قدسیؔ" کے نام سے پہلی بار شائع ہوئی خاتمۃ الطبع میں فرماتے ہیں:-

"بفضل خدا دو سال کے عرصے میں نامی گرامی شعرائے ہند سے جن صاحبوں سے کہ تعارف تھا اور جن سے نہ تھا تو ان سے بذریعہ خطوط خمسے تضمین کرا کے بہم پہنچائے ...

...... اور برعایت مضامین رنگین اس (مجموعے) کا نام 'چمن مدح نبیؐ' رکھا۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ تضامین غزل قدسیؔ کا نعتیہ مشاعرہ ایک من گھڑت داستان ہے اور 'حدیث قدسیؔ' بطور مجموعۂ تضامین مشاعرۂ مفروضہ محض ایک قیاس ہے۔

سید وزیر الحسن کا یہ کہنا بھی کہ غالبؔ کے ہاں تضمین گویا ممنوع تھی اور کہ انھوں نے یہ اصول صرف نعت گوئی کے لیے توڑا ہے درست نہیں ہے فن سخن میں عموماً "تضمین" مستقل نظم کا درجہ نہیں رکھتی۔ کوئی دیوان اٹھا کر دیکھ لیجیے تضمین کا حصہ بہت کم ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں غالبؔ کے ہاں اگر ایک دو تضمینیں بھی مل جائیں تو وہ اس فن میں ایک عمومی شاعر کے برابر آجاتے ہیں۔ اس طرح فنی تضمین کے ضمن میں غالبؔ کی انفرادیت اس بنا پر ڈھونڈھنا کہ ان کے ہاں تضامین کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں بے کار سی بات ہو جاتی ہے۔ غالبؔ کے ہم عصر مشاہیر میں مومنؔ کے کلام میں پندرہ بیس تضمینیں ضرور مل جاتی ہیں۔ مگر ذوقؔ کے کلام میں تو یہ صنعت سوائے آزادؔ کے چند بیان کردہ معمولی واقعات کے بالکل ہی مفقود ہے۔ غالبؔ کے یہاں بھی نعتیہ تخمیس کے علاوہ تخمیس اور تضمین (جس سے مراد ایک شاعر کا

دوسرے شاعر کے پورے شعر یا مصرع یا اس کا ٹکڑا لے کر اپنے کلام میں باندھنا ہے) کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ تخمیس میں قدسیؔ کی نعتیہ غزل کی تضمین کے علاوہ بادشاہ ظفرؔ کی مشہور غزل[1] بر ردیف و قافیہ "شمشیر آدھی رہ گئی، دلگیر آدھی رہ گئی" پر غالبؔ کا خمسہ موجود ہے۔ مقطع ملاحظہ فرمائیے ؎

تم جو فرماتے ہو "دیکھ اے غالبؔ آشفتہ سر	ہم نہ تجھکو منع کرتے تھے؟ گیا کیوں اسکے گھر؟"
جان کی پاؤں اماں باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر	دل نے کی ساری خرابی لے گیا مجھکو، ظفرؔ

واں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی

"ایک دن مثل پتنگِ کاغذی" والی گیارہ شعر کی مثنوی سے اب کون واقف نہیں، یہ بھی فارسی کے اس پورے شعر کو ضامن بنا کر کہی گئی ہے ؎

"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست	می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست"

یہ پورے مصرعے کی تضمینیں تو غالبؔ کے ہاں متعدد ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

آہنگ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ	"عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"
غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ	"آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں"
مجھے جنوں نہیں غالبؔ و لے بقول حضورؔ	"فراق یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو"
قول حافظؔ کا ہے بجائے دوست	"ہر کرا پنج روز نوبت اوست"
گشتہ ام غالبؔ طرف با مشرب عرفیؔ کہ گفت	"روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است"

اب رہے قاضی محمد عمر صاحب جنھیں وزیر الحسن صاحب نے اس مفروضہ نعتیہ مشاعرے کی نظموں کے گلدستے کا مرتب بتایا ہے تو ان کی حیثیت سوا ایک ناقل کے اور کچھ بھی نہیں،

۱؎ دہلی اردو اخبار (تتمہ) ۱۷؍ اپریل ۱۸۵۳ء (بحوالہ "دیوان غالب کامل"، نسخۂ گپتا رضا ص ۳۱۸)

میرے اس بیان کی تصدیق کے لیے ضروری ہے کہ "حدیث قدسی" کے ارتقا پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے۔ مختلف ایڈیشنوں کے تقابلی مطالعے سے جو میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں، حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی:

۱۔ خمسۂ غزل قدسی یا چمن مدح نبیؐ | مطبع مصطفائی، دہلی سے محمد حسین خاں تحسین کے اہتمام سے طبع ہوئی۔ مطبع کے اندراج کے علاوہ سال تاریخ محمد نظام الدین جوشؔ[1] کے قطعہ سرورق سے بھی مستخرج ہوتا ہے ؎

جب ہوئی زیب وہ طبع خوشا صلّ علیٰ — نکہت تاریخ میں گلشن کی طرف میں جو گیا
بلبل از جوش طرب خواند بشاخ گلہا — وہ چلے گردید شگفتہ چمن مدح نبیؐ (۱۲۶۹ھ)

اس قطعے میں نزاکت یہ ہے کہ یہ قدسی ہی کی غزل پر خمسے کا ایک بند معلوم ہوتا ہے چونکہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں مرتب ہو کر ۳ صفر ۱۲۷۱ھ (۲۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء) کو شائع ہوئی تھی۔ اس لیے اس میں ۱۲۶۹ھ، ۱۲۷۰ھ اور ۱۲۷۱ھ تینوں سالوں کے قطعہ ہائے تاریخ ملتے ہیں۔ خاتمۃ الطبع میں ایک قطعہ تاریخ جس سے ۱۲۷۰ھ برآمد ہوتا ہے بہت دلچسپ ہے۔ یہ مرزا علی صاحب دہلوی نازنین تخلص کا طبع زاد ہے اور جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے ریختی میں ہے ؎

نازنیں تجھکو اک بتادوں بات — کہ نگوڑی بڑھی ہو بات تیری
سال چھپنے کے اس کتاب کے لکھ — اے بوا اس میں ہے نجات تیری[2]

[1] منشی نظام الدین جوشؔ خلف وحید الدین پنجابی شگفتہ طبیعت پائی تھی اور علی گڑھ میں رہا کرتے تھے۔ ....

[2] خم خانۂ جاوید۔ جلد دوم ص ۳۸۵ ۔ یہاں تری نہیں بلکہ تیری ہی شمار میں آئے گا ورنہ ۱۰ اعداد کم ہو جائیں گے۔

کتاب کے آخری صفحات میں تحسین کا ایک طویل اور معنی خیز قطعہ "در ذکر شعراء" بھی موجود ہے جس میں مرتب سمیت ان ایک سو سات شعراء کا ذکر ہے جن کے خمسے زینتِ کتاب ہیں، گو تحسین استاد ذوق کے شاگرد تھے تاہم وہ ذوق کو تضمین غزل قدسی پر آمادہ نہیں کر سکے۔ وجہ شاید یہ ہو کہ شاہ ظفر کی تضمین کے ہوتے ہوئے ذوق نے اپنی شمولیت کو بادشاہ کے احترام کے منافی خیال کیا ہو گا۔ قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

معنیٔ بیتِ دو عالم شہ ذی جاہ ظفر — لفظ معنی سخاوت شہ با فتح و ظفر

غالبؔ کا ذکر اس طرح آتا ہے ؎

ماہر فن سخن یعنی جناب غالبؔ — کہ ہیں حب اسد اللہ کے بیشک مظہر

پھر بہت سے شعراء کا ایک ساتھ ذکر کر کے کہا ہے ؎

یہ سخن رس ہیں سخن سنج ہیں یا بے مثل و عدیل — ہیں یہ مشہور سبب اقلیم سخن کے سرور

اور مقطعے میں خود تحسین مجسم انکسار بنے کھڑے ہیں ؎

ان میں تحسین بھی داخل ہے مگر جیسے فقیر — آگے شاہوں کے کھڑا ہووے بحال ابتر

۲۔ حدیث قدسی | مطبع مصطفائی واقع کانپور سے بدیع الزماں کے اہتمام سے ۱۲۸۱ھ میں طبع ہوئی۔ سرورق پر یہ قطعہ درج ہے ؎

طالب مدح نبی را ہر طرف — نعرہ ہٰذا حدیث قدسی است
شکر خالق را کہ از طبع بدیعؔ — شہرۂ ہٰذا حدیث قدسی است

اور خاتمۃ الطبع میں یہ قطعۂ تاریخ درج ہے ؎

چو دریں آوان بعون کردگار — نعت شاہ انبیا مطبوع شد
گفت شائقؔ سال آں از روئے طبع — وصف محبوب خدا مطبوع شد

(حاشیہ ص ۴۴۸ پر)

مادہ درج نہیں ہے مگر شمار کرنے پر چھٹے مصرعے (۱۲۷۰) میں 'ط' کے ۹ عدد ملانے سے ۱۲۷۹ھ برآمد ہوا ہے۔ یہ قطعہ آغاز طبع میں کہا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کتاب کی ترتیب کا دعویٰ قاضی محمد عمر صاحب نے ان لفظوں میں (حدیث قدسی ع۲، ع۳، ع۴) کیا ہے:۔

"...........بارہ سو بہتر[۱۲۷۲] ہجری قدسی میں فقیر احقر قاضی محمد عمر کے خاطر میں اس اندیشہ نے خطور کیا اور فکر رسا نے اس کوچہ میں رہنمائی کی کہ اگر مخمسات غزل قدسی.......جس قدر دستیاب ہو سکیں جمع کر کے اس صورت سے یہ مجموعہ مرتب کیا جائے کہ شاعر کے نام کے نیچے مختصر حال بھی اس کا مرقوم ہو تو البتہ لطف سے خالی نہ ہوگا اور اسی اندیشہ کی ممد و معاون ہوئی رائے....... حافظ انعام اللہ ساکن[۱] پانی پت کی جس طرح جی چاہتا تھا صورتِ مراد نے نقش باندھا.......اس مجموعے کی تالیف و ترتیب سے فراغت ہوئی اور نام اس کا 'حدیث قدسی' رکھا۔"

یاد رہے کہ 'خمسہ ہائے غزل قدسی' مرتبہ محمد حسین خاں تحسین ۱۲۷۱ھ میں شایع ہوئی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لے شائق، خدا بخش خلف شیخ محمد حاجی باشندہ کانپور، سید وارث علی سیفی کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان ۱۲۹۵ھ میں چھپا تھا۔ تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی۔ ایک کتاب بھی فن تاریخ گوئی میں "آئینۂ تاریخ" کے نام سے ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں چھپی تھی۔ جس میں صرف چودہ سو (۱۴۰۰) تک کے مادے شامل تھے۔ دوسرے ایڈیشن (۱۸۹۸ء) میں مادوں کی تعداد دو ہزار (۲۰۰۰) تک کے اعداد تک کر دی گئی تھی (یہ دونوں ایڈیشن مع دیوان شائق میرے کتب خانے میں موجود ہیں) کتاب میں ۴۹۶ کے تحت بطور مادہ "حدیث قدسی" بھی شامل ہے۔ (حواشی صفحہ ہذا) لے ان صاحب کے متعلق اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

اور 'حدیث قدسی' کی ترتیب کا خیال.......قاضی محمد عمر صاحب کو ۱۲۷۲ھ میں آیا جو ۱۲۷۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ دراصل قاضی صاحب کو اتنی مدت تک انتظار کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن انھیں ایسا کرنا پڑا کیونکہ وہ "چمن مدح نبیؐ" کی نقل کو فوراً اپنے نام سے شایع نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ "چمن مدح نبیؐ" کی اشاعت کے آٹھ سال بعد معمولی حذف و اضافے کے ساتھ انھوں نے اس تالیف کو اپنی کہہ کر 'حدیث قدسی' کے نام سے چھاپ دیا۔[۱] حذف یہ کیا کہ تحسین کی کتاب کے سرورق کی جگہ "حدیث قدسی" کا ٹائٹل اور قطعہ "ذکر شعراء" کی جگہ اپنے رنگ میں غزل "ذکر شعراء" کہہ کر ڈال دیے اور اضافہ یہ کیا کہ تحسین کے ایک سو سات[۱۰۷] شعراء کے علاوہ تیرہ[۱۳] دیگر شعراء کے خمسے بڑھا کر تعداد مخمسات ایک سو بیس[۱۲۰] کر دی اور تاریخ خاتمہ کتاب درج کر دی۔ بعد ازاں طبع دوم میں بارہ مزید خمسے[۳] بدیع الزماں مہتمم مطبع مصطفائی کانپور کے ذریعہ موزوں کروا کے کتاب کے آخر میں بعنوان "ملحقات" شامل کر دیے۔ تحسین نے 'خمسہ ہائے غزل قدسی' کے اختتام پر ناظرین سے امید کی تھی کہ ان کی محنت پر نظر کر کے وہ انہیں دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے۔ مگر انجام برعکس ہوا۔ قاضی محمد عمر صاحب تحسین کو دعائے خیر سے یاد تو کیا فرماتے انھوں نے خمسہ ہائے غزل قدسی (چمن مدح نبیؐ) کو

لے "ذکر شعراء" کے قطعے سے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب قاضی تخلص کرتے تھے اور یہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ ۲ے حقیقت یہ ہے کہ قاضی محمد عمر نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پیدا شدہ حالات کا مکمل فائدہ اٹھایا، نظام درہم برہم ہو چکا تھا کسی کو کچھ ہوش نہ تھا۔ انیسویں صدی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور ۱۸۰۱ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ ایسے میں تحسین کی "چمن مدح نبیؐ" کسے یاد رہتی۔ اب بھی اس کا ایک ہی نسخہ معلوم ہے جو خوش قسمتی سے میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ ۳ے یہ بارہ خمسے دس شاعروں کے ہیں۔ ایک شاعر مخلص تخلص کے تین خمسے ہیں۔

مستقبل کے ذہنوں ہی سے فراموش کر دیا اور کہیں ان کا ذکر ہی نہیں آنے دیا۔

قاضی صاحب نے پیش لفظ میں کہا تھا کہ وہ ہر شاعر کے نام کے نیچے اس کا مختصر حال بھی مرقوم کریں گے اور دعوی بھی کیا تھا کہ جیسا وہ چاہتے تھے ویسا ہی صورت مراد نے نقش باندھا، مگر قاضی صاحب کو کہیں اپنے لکھے کا پاس نہیں چنانچہ مختصر حال تو کیا عنوانات میں شعرا کے نام وغیرہ بھی بعینہ وہی ہیں جو تحسین نے 'خمسہ ہائے غزل قدسی' میں دیے ہیں۔ قاضی صاحب نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں بڑھایا۔

۳۔ حدیث قدسی | یہ ایڈیشن قاضی صاحب والے ایڈیشن کا نقش اول ہے اور (بروز جمعہ) دہم ذی حجہ ۱۲۷۹ھ (۲۹ مئی ۱۸۶۳ء) کو طبع ہوا۔ یہ نقش اول یوں ہے کہ اس میں 'ملحقات' شامل نہیں ہیں۔ باقی ہر چیز وہی ہے چونکہ اس کے پہلے چھ صفحے غائب ہیں اس لیے اسے حدیث قدسی ع ۲ کے بعد درج کیا گیا ہے۔ ورنہ خاتمۃ الطبع میں قطعہ تاریخ وہی ہے جو ایڈیشن ع ۲ میں ہے۔ بلکہ اس پر مکمل تاریخ طبع دی گئی ہے۔ مطبع کا علم نہ ہو سکا کتابت قطعاً جداگانہ ہے۔

۴۔ حدیث قدسی | یہ ایڈیشن مطبع فتح الکریم بمبئی کا مطبوعہ ہے۔ غالباً ۱۲۹۹ھ میں چھپنا شروع ہوا اور ۱۳۰۱ھ میں

" بصد تصحیح تام خوش خطی مالا کلام باہتمام جناب قاضی محمد فتح محمد و صالح محمد و عبدالکریم صاحب برادران قاضی ابراہیم صاحب مرحوم فرزندان افضل الحاج قاضی نور محمد صاحب مغفور۔۔۔۔۔۔"

شائع ہوا۔ یہ قاضی محمد عمر ہی کے ملحقات والے ایڈیشن کا ری پرنٹ ہے صرف شائق کے قطعہ تاریخ میں 'ط' کی جگہ 'ل' کے اعداد ڈال دیے گئے ہیں اور شائق کی جگہ ہاتف لکھ دیا

گیا ہے۔ تیسرا اور چوتھا مصرع ملاحظہ ہو ؎

گفت ہاتف سال آں از روے لطف
وصف محبوب خدا مطبوع شد
۱۲۷۰ + ۳۰ = ۱۳۰۰ھ

آخر میں ایک ورق مطبع والوں نے بڑھا دیا ہے۔ سال طباعت ۱۵ محرم ۱۳۰۰ھ (۲۷ نومبر ۱۸۸۲ء) درج ہے۔ پھر محمد احسان الٰہی ازہر کا قطعہ تاریخ ہے ؎

بے سر جہد گفت ہاتف غیب
بس بگو از ہنر عجیب و غریب
۱۳۰۳ - ۳ = ۱۳۰۰ھ

۵۔ صحیفۂ قدسی حصہ دوم حدیث قدسی | سرورق سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کو حاجی سید شمشیر علی ولد میر عزیز اللہ صاحب ساکن گوہانہ ضلع روہتک نے (جو اس وقت دہلی میں مقیم تھے) ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) میں جمع کیا اور 'محمود المطابع' دہلی سے طبع کرا کے شائع کیا۔ پیش لفظ میں فرماتے ہیں کہ انہیں شوق مدح خوانی حضرت سرور کائناتؐ بدرجہ غایت ہے۔ اس لیے انہیں اکثر خمسے اور قصیدے یاد ہیں جنھیں وہ جلسوں وغیرہ میں سنایا کرتے تھے اور لوگ اس بات کے طالب رہتے تھے کہ وہ یہ خمسے انہیں نقل کر دیں چونکہ یہ ممکن نہ تھا اس لیے انھوں نے ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں مجموعہ نعت کے نام سے انہیں دو حصوں میں چھپوا دیا پھر

"۔۔۔۔۔۔ میری نظر سے 'حدیث قدسی' گذری جو کہ ۱۲۷۳ھ[1] (۱۸۵۶ء) میں

---

[1] حدیث قدسی کا قاضی محمد عمر کے اہتمام سے ۱۲۷۳ھ میں چھپنا قرین قیاس نہیں کیونکہ یہ رسالہ خمسہ ہائے غزل قدسی (چمن مدح نبیؐ) از محمد حسین خاں تحسین ہی کی نقل ہے جو ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ قاضی صاحب یہ جرأت رندانہ نہیں کر سکتے تھے کہ دو ہی سال کے اندر اندر اس سرقے کو اپنے نام سے طبع کروا کے خاص و عام کیلئے شائع کریں اور تحسین کا نام تک نہ لیں۔ غالباً ۱۲۷۳ھ قاضی محمد عمر صاحب کا بیان کردہ ۱۲۷۳ھ یعنی وہ سال ہے جس میں انھیں 'حدیث قدسی' ترتیب دینے کا خیال آیا۔ اسکی طباعت ۱۲۷۹ھ (بروز جمعہ) دہم ذی الحجہ (۲۹ مئی ۱۸۶۳ء) کو ہوئی تھی۔

قاضی محمد عمر صاحب نے جمع کر کے [۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں] چھپوائی تھی۔ اس کو دیکھ کر بے اختیار دل نے چاہا کہ میں بھی قدسی کی غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں۔ بس میں نے بھی بعنایت الٰہی کمر ہمت کو باندھ کر جنوری ۱۸۸۵ء کو دہلی کے اخباروں میں اشتہار دینے شروع کیے اور کثرت سے شاعروں کو بیرونجات میں خط لکھے۔ اب بفضل ایزدی عرصہ دو سال میں یہ مجموعہ تیار ہو گیا .... اس کے پڑھنے والوں سے امید ہے کہ اس کو پڑھ کر .... بندہ کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں اور بندہ نے .... التزام کیا ہے کہ جس قدر خمسے پہلے مجموعے حدیث قدسی میں چھپ چکے ہیں وہ اس میں شامل نہیں کیے گئے۔ فقط۔"

حاجی شمشیر علی بھی محمد حسین خاں تحسین کا جو غزل کے مخمسات کے اصل مولف ہیں نام نہیں لیتے اور قاضی محمد عمر کی طرح غلط دعوے کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ میرے نسخے کے چند آخری اوراق ضایع ہو چکے ہیں اس لیے خاتمۃ الطبع اور قطعہ ہائے تاریخ کا علم نہیں۔ تاہم ان کا یہ دعوی کہ پہلے مجموعۂ حدیث قدسی کے خمسے ان کے رسالے میں شامل نہیں کیے گئے، درست نہیں۔ حافظ عبدالرحمن احسان، مرزا صفدر علی بیگ بلند، زین العابدین خاں حزیں، مرزا قادر بخش صابر، قادر علی عبد، میاں ناجی وغیرہم کے خمسے حاجی شمشیر علی نے قاضی محمد عمر ہی کے مجموعے سے اڑائے اور قاضی محمد عمر صاحب کی دکان تو محمد حسین خاں تحسین ہی کے مال سے سجائی گئی تھی۔

حاجی صاحب رقم طراز ہیں کہ انھوں نے جنوری ۱۸۸۵ء کو دہلی کے اخبارات میں اشتہار دینا شروع کیے اور کثرت سے شعرائے بیرونجات کو خط لکھے اور نتیجے

کے طور پر خدا کے فضل و کرم سے دو سال میں یہ مجموعہ (حدیث قدسی دوم) تیار ہو گیا۔ مندرجہ بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دسمبر ۱۸۸۶ء یا جنوری ۱۸۸۷ء تک حاجی صاحب کے پاس ان کی کوششوں سے خمسوں کی خاصی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔

اگر یہ سچ ہوتا تو واقعی یہ ایک قابل قدر کارنامہ ہوتا۔ مگر یہ سچ نہیں ہے۔ حاجی صاحب بھی قاضی محمد عمر صاحب ہی کے مقلد و ہم مسلک تھے اور اخلاقی جرات میں انکے جانشین تھے۔ انھوں نے کچھ خمسے قاضی محمد عمر کے یہاں سے نقل کر دیے کچھ خمسے بذریعہ خط و کتابت یا ذاتی تعلقات کی بنا پر حاصل کیے اور باقی کی ایک بڑی تعداد ہفتہ وار جریدۂ روزگار مدراس سے لے کر بغیر کسی حوالے کے درج کتاب کر دی۔ اس بڑی چوری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۸ راگست ۱۸۸۵ء سے ۳۱ر جولائی ۱۸۸۶ء کے پرچوں سے کم از کم بیس خمسے لے کر زیب حدیث قدسی دوم کیے گئے ہیں۔

۶۔ جریدۂ روزگار | بارہ بڑے صفحوں کا یہ اخبار مدراس سے ۱۸۷۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ مالک سید میر تقی شاہ قادری آفندی تھے۔ ۴-۱۹۰۳ء تک جاری رہا اور اس وقت اس کے مالک سید مرتضی تھے۔ غزل قدسی پر جتنی تضمینیں اس اخبار میں شایع ہوئی ہیں شاید اور کہیں نہیں ہوئیں۔ چار سال ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۶ء، ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۰ء کے پرچوں میں دو سو سے زائد خمسے تو میرے کتب خانے میں موجود ہیں، قیاس غالب ہے کہ خمسوں کی مجموعی تعداد پانچ سو کے قریب ہوگی۔ کوئی صاحب حدیث قدسی حصہ سوم بلکہ چہارم بھی تیار کرنا چاہیں تو اس جریدے کی مدد سے بآسانی کر سکتے ہیں۔ مگر ان سے میری گذارش ہے کہ وہ جریدۂ روزگار کے حوالے کو نظر انداز نہ کریں اور محمد حسین خاں تحسین مرحوم کو دعائے خیر سے یاد کرنا نہ بھولیں۔

ضمیمہ

غزل[1] قدسی در نعت سرورؐ

ڈاکٹر سمیع الدین احمد، لکچرار شعبہ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ کا ایک مضمون بعنوان "نعت قدسی اور اس کی مقبولیت" 'معارف' دسمبر ۱۹۷۶ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر نعت قدسی (مرحبا سید مکی مدنی العربی) پر کہی ہوئی متعدد تضمینوں کے دو جداگانہ مجموعے "حدیث قدسی" اور "صحیفۂ قدسی" رہے ہیں جو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں۔ کتاب "حدیث قدسی" قاضی محمد عمر نے ۱۲۷۲ھ میں اس مشہور و معروف نظم پر مختلف شعراء کے کہے ہوئے خمسے جمع کر کے ترتیب دی جو ۱۲۷۹ھ میں چھپی۔ مجموعہ صحیفہ قدسی حاجی سید شمشیر علی نے ۱۳۰۳ھ (مطابق ۱۸۸۵ء) میں ترتیب دینا شروع کیا جو ۱۳۰۴ھ میں محمود المطابع دہلی سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا مضمون جو ص۴۴۵ سے ص۴۶۹ تک پھیلا ہوا ہے، انہیں دو مجموعہ ہائے مخمسات پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے میرا مضمون "غزل قدسی اور تضمین غالب[2]"، ان کی نظر سے نہیں گزرا ورنہ شاید انہیں اپنے مضمون کی بیشتر باتیں لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

اسی قسم کی نامکمل واقفیت کی بنا پر سید وزیر الحسن نے بھی فرض کر لیا تھا کہ قاضی محمد عمر والا مجموعہ مخمسات "حدیث قدسی" دراصل دلی کے ایک نعتیہ مشاعرے کا گلدستہ ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا غالباً آخری نعتیہ مشاعرہ[3] تھا۔ میرا مضمون مطبوعہ

---

[1] مضمون راقم مطبوعہ 'معارف' بابت ماہ اپریل ۱۹۷۷ء کی تلخیص [2] مضمون راقم مطبوعہ 'آج کل' دلی فروری ۱۹۷۴ء [3] دلی کے اہم نعتیہ مشاعرے کی تضمینیں "آج کل" ۱۵ فروری ۱۹۷۴ء

'آج کل' فروری ۱۹۷۴ء اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے شایع کیا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قاضی محمد عمر صاحب 'حدیث قدسی' کے اولین مرتب نہیں۔ پہلا مجموعہ محمد حسین خاں تحسین شاگرد ذوق (جو اس عہد میں مطبع مصطفائی دہلی کے مالک و مہتمم تھے) نے اس خیال سے کہ "بعد چھوٹ جانے اس دار فانی کے واسطہ بقائے نام اور وسیلہ نیکی سرانجام کا ہو" اس وقت کے نامی گرامی شعرائے ہند سے کچھ ذاتی تعارف کی بنا پر اور کچھ بذریعہ خط و کتابت مخمسات حاصل کر کے ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں مرتب کر کے چھپوانا شروع کیا تھا۔

میرے کتب خانے میں تضامین غزل قدسی کے (جریدۂ روزگار کو شمار کر کے) چھ مجموعے ہیں (ان تمام مجموعوں کی مختصر تفصیل پہلے صفحات میں آچکی ہے اور تضامین غزل قدسی کے ارتقا کا اجمالی جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اس لیے انہیں دوبارہ پیش کرنے سے احتراز کیا جاتا ہے) ان کے پڑھنے سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ قاضی محمد عمر اور حاجی شمشیر علی دونوں قطعی نامعتبر شخصیتیں ہیں اور ادنیٰ اخلاق کی مالک ہیں۔

ڈاکٹر سمیع الدین احمد صاحب اس نعتیہ غزل کو حاجی محمد جان قدسی مشہدی کی طبع زاد نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ان کے ہم نام مولانا محمد جان قدسی دہلوی کا نتیجۂ فکر ہے جو "انیسویں یا اٹھارویں صدی یعنی عہد متاخرین کا شاعر رہا ہوگا" انکے نزدیک اس کے وجوہ کم و بیش یہ ہیں:۔

(۱) حاجی شمشیر علی صاحب کی کتاب 'صحیفۂ قدسی' کے اصل متن میں مثنوی کے آغاز سے پہلے بطور عنوان یہ عبارت ملتی ہے۔

(خمسہ بر غزل حضرت مولانا محمد جان صاحب قدسی مرحوم دہلوی)

جس سے ظاہر ہے کہ شاعر کا وطن دہلی تھا۔

(۲) مرحوم اور رحمۃ اللہ کے لفظوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شاعر (قدسی) کے انتقال کو زیادہ مدت نہیں گذری۔

(۳) جامع صحیفہ قدسی (حاجی شمشیر علی) کو نعت نگار (قدسی دہلوی) کی ذات سے تعلق خاطر تھا لہٰذا خمسوں کی ترتیب و تدوین کے وقت اس کو دہلوی لکھنا ایک ایسی شہادت ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ حاجی صاحب نے یہ بات بلا تحقیق از خود نہیں لکھی ہوگی اور اس بات کا قطعی امکان نہیں کہ ان کو سہو ہوا ہو۔ مرتب کی حیثیت ایک واقف کار مورخ کی سی ہے اور اس کا بیان محقق اور مستند ہے۔

(۴) عام طور پر حاجی محمد جان قدسی مشہدی کے دیوان یا کلیات کے متداول نسخوں میں یہ نعت موجود نہیں۔

یہاں ان تمام وجوہ کا نمبر وار جائزہ لیا جاتا ہے۔

(ا) (۱) قدسی کے بعد دہلوی لکھنا قطعی سہو مرتب ہے۔ اوپر مخمسات غزل قدسی کے پانچ مختلف مجموعوں کا اجمالی ذکر آچکا ہے۔ یہ سب میرے کتب خانے میں موجود ہیں اور میرے سامنے ہیں۔ ان سب کو دیکھ کر کوئی بھی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ ان میں کتابت، طباعت اور معیار کلام کے لحاظ سے حاجی شمشیر علی کا مرتبہ مجموعہ صحیفہ قدسی سب سے ادنیٰ درجے کا ہے۔ پروف ریڈنگ میں بھی قطعاً احتیاط نہیں برتی گئی اور حاجی صاحب کا اپنا کلام بھی معمولی اور سطحی ہے۔ حاجی صاحب خود سرورق پر صحیفہ قدسی کو "مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان[1] بر غزل مولانا محمد جان صاحب قدسیؒ" لکھتے ہیں۔ اگر

[1] یہ بات بھی حاجی صاحب نے تحسین ہی سے لی۔ تحسین لکھ چکے تھے کہ انھوں نے خمسے (بقیہ حاشیہ ص آیندہ)

ان کے ذہن میں کوئی قدسی دہلوی ہوتے تو وہ ان تضامین کو "مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان" کیوں لکھتے۔ کیا دہلوی شاعر شعرائے ہندوستان سے الگ ہیں؟ بالفرض حاجی صاحب نے جان بوجھ کر لکھا بھی ہے تو اس میں زیادہ سے زیادہ یہ خیال کارفرما ہو سکتا ہے کہ قدسی شاہجہاں کے دربار سے منسلک تھا اور شاید اس نے اس دربار سے ملک الشعرائی کا خطاب اول بھی پایا تھا۔

(ب) تحسین کی "خمسہائے غزل قدسی" کے ص ۹۹ پر عنایت اللہ خاں قیس کا قطعہ تاریخ اتمام اس طرح شروع ہوتا ہے

کیا ہی قدسی کی غزل نعت میں ہے صل علیٰ　　　جس کے ہر مصرع میں ہر حرف ہے موتی سا جڑا

اس کا تیسرا شعر یہ ہے

شاعروں نے جو لکھے ہند کے خمسے اس کے　　　جن کے ہر بند پہ قرباں ہو دل وجاں اس کا

اس شعر کے مصرع اول سے صاف ظاہر ہے کہ ہند کے شاعروں نے خمسے اس شاعر کے کلام پر کہے ہیں جو خود ہندوستان کا رہنے والا نہیں ہے۔

(ج) تحسین ہی کے مجموعے کے ص ۳ پر حاجی محمد اسحٰق اسحٰق کا خمسہ درج ہے، اس کا پہلا بند دیکھئے

ہے یہ اسحٰق ترا ایک غلام عجمی　　　اس پہ ہو یک نگہ لطف رسول عربی

تیرے مداح ہیں سعدی و ظہیر و قدسی　　　"سیدی انت حبیبی......

اس غلام عجمی کا ذہن قدسی کے بارے میں قطعاً صاف ہے۔ وہ اسے سعدی

(بقیہ حاشیہ ص سابق) "اس وقت کے نامی گرامی شعرائے ہند" سے حاصل کیے۔ اگر انکے ذہن میں کوئی قدسی ہندی ہوتا تو وہ "شعرائے ہند" کی تخصیص کیوں کرتے؟ شعرائے بیرون ہند، شعرائے ایران وغیرہ کہتے۔

اور نظیری کے ساتھ رکھتا ہے خسرو، فیضی وغیرہ کے ساتھ نہیں۔

(د) تحسین کے خمسہائے غزل قدسی کے سرورق پر قطعہ تاریخ طبع سے پہلے یہ الفاظ ہیں:-

"تاریخ طبع خمسہائے غزل قدسی فخر شعراء"

طباعت کا آغاز ۱۲۶۹ھ میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں فارسی زبان کا شباب ابھی باقی تھا۔ غالب، مومن، صہبائی، آزردہ سب حیات تھے۔ کیا اس وقت یا اس سے سو پچاس سال پہلے کا کوئی ایسا عظیم دہلوی (یا ہندوستانی) جس کا نام محمد جان اور تخلص قدسی تھا اور جو اس لائق تھا کہ اسے فخر شعراء کہا جا سکے اس وقت کے فارسی گویوں اور تذکرہ نگاروں کی نظر سے اوجھل رہ سکتا تھا؟

(ہ) خمسہائے غزل قدسی کے ص۹۶ پر ایک مادہ تاریخ یوں نکالا ہے۔

بہر آغاز طبع دے فی الحال   نغمۂ بلبلان ہند بگفت
۱۲۶۹ھ (مطابق ۵۳-۱۸۵۲ء)

آخر تحسین بار بار بلبلان (شاعران) ہند کی تخصیص کیوں کرتے ہیں؟

۲- مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ سے وقت کی تعیین کیونکر ہو سکتی ہے صرف یہ متعین ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جس کے لیے یہ دعا کی گئی ہے زندہ نہیں۔ غرض کہ یہ الفاظ کسی مرے ہوئے کے لیے آتے ہیں اس کے لیے وقت کی قید نہیں۔ کوئی شخص کسی زمانے میں بھی فوت ہوا ہو اس کے لیے یہ الفاظ بولے اور لکھے جا سکتے ہیں، ان الفاظ سے یہ اندازہ کرنا کہ قدسی تخلص کا کوئی شاعر حال ہی میں فوت ہوا ہے قطعاً نادرست ہے۔

۳- جامع صحیفۂ قدسی حاجی شمشیر علی کو قدسی سے قطعی تعلق خاطر نہ تھا۔ حاجی صاحب محقق تھے نہ مورخ، عالم تھے نہ مستند۔ وہ محض مدح خوانی رسول اکرم ص کے بدرجہ

غایت شائق تھے۔ اس وجہ سے اکثر خمسے اور قصیدے وغیرہ انھوں نے یاد کر لیے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتے اور یہ یاد کیا ہوا کلام سناتے تو لوگ ان سے اس کلام کے طالب ہوتے چنانچہ لکھنے یا نقل کرنے کی زحمت سے بچنے کے لیے انھوں نے ۱۲۹۳ھ میں مجموعۂ نعت (غزل قدسی کے خمسے نہیں) کے دو حصے چھپوا دئیے۔ اس وقت تک قدسی سے تو کیا حدیث قدسی مرتبہ قاضی محمد عمر تک سے ان کو تعلق خاطر نہ تھا حالانکہ حدیث قدسی کو (جو تحسین کی خمسہائے غزل قدسی کی نقل ہے) چھپے چودہ برس گزر چکے تھے۔ وہ اس بات کا خود اقرار کرتے ہیں اس لیے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

۴- ممکن ہے کہ یہ نعت[1] قدسی کے کلیات اور دیوان کے متداول نسخوں میں نہ ہو، مگر محض اس بنا پر اسے کسی مفروضہ قدسی دہلوی کی ملک قرار دے دینا صریحاً زیادتی ہے۔ متداول نسخوں (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) میں شاعر کے سارے کلام کا شامل ہونا ضروری نہیں۔ تاہم مجھے اصرار نہیں کہ یہ نعت قدسی مشہدی ہی کی ہے، کسی اور قدسی کی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر کسی قدسی دہلوی کی یقیناً نہیں۔ ہو سکتا ہے "قدسی" بطور تخلص رکھا ہی نہ گیا ہو۔

---

[1] نعت "غزل قدسی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس لیے غزلیات قدسی میں بھی اسے بطور خاص تلاش کر لینا چاہیے۔ میری نظر سے دیوان یا کلیات قدسی نہیں گزرا۔

اسامہ بن منقذ کی کتاب الاعتبار اور دوسری تصانیف

از

پروفیسر مختار الدین احمد علی گڑھ

معارف کا نہ مئی کا شمارہ ملا نہ ستمبر کا دونوں شمارے ڈاک کی بدنظمیوں کی نذر ہوئے۔
ایک دوست نے بتایا کہ ستمبر کے شمارے میں اخبار علمیہ کے تحت اسامہ بن منقذ الشیزری (۴۸۸-۵۸۴ھ) کی کسی نئی دریافت شدہ تصنیف کا حال چھپا ہے۔ اکتوبر کا شمارہ موصول ہوا تو محب گرامی شیخ نذیر حسین کے مکتوب سے معلوم ہوا کہ وہ اسامہ کی کتاب الاعتبار کا نیا اڈیشن ہے لیکن انھیں مقام طباعت و اشاعت کی اطلاع نہ مل سکی۔ میری سلطان صلاح الدین ایوبیؒ ان کے معاصرین اور شامی مصنفین سے دلچسپی بہت قدیم ہے اس لیے خیال تھا کہ آپ کو لکھوں گا کہ معارف (ستمبر) کے مندرجات سے آگاہی بخشیں۔ چند دن ہوئے کہ تعمیر حیات کا ۲۵ ستمبر کا شمارہ موصول ہوا جس سے معلوم ہوا کہ استاذ جلیل شیخ عبدالفتاح بن محمد ابوغدہ اس کتاب کا نیا اڈیشن اپنے مفید حواشی و تعلیقات کے ساتھ شایع کر رہے ہیں۔
اور اس پر انھوں نے مقدمہ مخدوم گرامی علامہ سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی سے لکھوایا ہے جس کا اردو ترجمہ اس شمارے میں شایع ہوا ہے۔ حضرت مولانا کا علم مستحضر ہے اور قلم ایسا رواں دواں کہ جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرتے ہیں۔ انھوں نے بہت مفید اور خوبصورت مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

اور مرتب علام کی اس خواہش کا پورا خیال رکھا ہے کہ مقدمہ ایسا ہو جو "اسلامی زندگی کے صحیح رخ اور عزت و شرف کی طرف چلنے، جہاد فی سبیل اللہ اور ہر میدان میں خدا کے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے دلوں کی انگیٹھی کو گرما دے"۔ کتاب تو ابھی شاید زیر طبع ہے لیکن مولانا کے مقدمے کے اردو ترجمے سے کتاب الاعتبار کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور اس سے اردو دنیا اس نامور مجاہد اور مقتدر مصنف اور اس کی ایک اہم کتاب سے روشناس ہو جاتی ہے۔
محقق علام کے اس اڈیشن کی اطلاع سے مجھ پر مایوسی اور خوشی کا ملا جلا ردعمل ہوا۔ مایوسی کم، خوشی زیادہ۔ مایوسی یوں کہ میں نے سمجھا تھا کہ اس کتاب کا کوئی دوسرا مکمل نسخہ دریافت ہو گیا ہے۔ فرانسیسی مستشرق ہارتوغ درانبورغ (Hartwig Derenbourg) کو بیسویں صدی کے اوائل میں اسکوریال (ہسپانیہ) کے کتب خانے میں کتاب الاعتبار کا ایک ناقص الاول نسخہ ملا تھا جس میں صرف ۸۸ اوراق تھے، ابتدائی ۲۱ اوراق ضایع ہو گئے تھے۔ اس نے اسے پیرس سے ۱۸۸۴ء میں شایع کیا۔ فلپ ھٹی (Hitti) کا اڈیشن بعد کو ۱۹۳۰ء میں نکلا لیکن وہ بھی اسی ناقص نسخے پر مبنی تھا۔ خیال ہوا کہ اس پون صدی کے عرصے میں کوئی مکمل نسخہ مل گیا ہوگا جسے شیخ حفظہ اللہ نے مرتب کیا ہے۔ خوشی اس بات کی ہوئی کہ پیرس کا اڈیشن تو عنقا کا درجہ رکھتا ہے۔ پرنسٹن کا اڈیشن بھی اب بہت کمیاب بلکہ نایاب ہے، اب شیخ کے مرتب کردہ اڈیشن کی طباعت کے بعد عام شائقین کے سامنے آ جائے گا اور دونوں مستشرقوں کے لکھے ہوئے تعلیقات و حواشی پر مفید اضافے بھی اس میں ملیں گے۔
شیخ نذیر حسین صاحب نے لکھا ہے کہ "اسامہ نے عربی کے نثری ادب کا انتخاب بھی

کیا تھا جو مدت ہوئی قاضی احمد محمد شاکر کی تصحیح کے بعد قاہرہ سے شایع ہو چکا ہے"۔ یہ انھوں نے سہواً لکھ دیا ہے۔ یہ عربی نظم کا بہت قیمتی انتخاب ہے۔ جس کا نام لباب الآداب ہے۔ سنہ ۵۹۰ھ کا مکتوبہ نسخہ رسالہ المقتطف (قاہرہ) کے اڈیٹر یعقوب صروف کو ملا تھا جس نے اس نسخے پر ایک سلسلۂ مضامین سنہ ۱۹۰۷ء اور سنہ ۱۹۰۸ء کے متعدد شماروں میں لکھ کر کتاب کی اہمیت واضح کی تھی۔ اس کتاب کی دریافت کا سہرا یعقوب صروف کے سر ہے۔ بعد کو ایک متاخر العہد نسخہ سنہ ۱۰۹۲ھ کا لکھا ہوا دار الکتب المصریہ میں ملا۔ الاستاذ احمد محمد شاکر نے ان دونوں نسخوں کی مدد سے اس کا متن تیار کیا جو قاہرہ سے سنہ ۶۳۵ میں شایع ہوا۔ اسے چالیس پینتالیس سال ہو گئے، اب یہ مطبوعہ نسخہ بھی نہیں ملتا۔ کمیابی کے باعث اس کا عکسی اڈیشن شایع ہونے والا تھا۔

شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ کتاب الاعتبار کا انگریزی میں ترجمہ ھٹی نے شایع کیا ہے یہ بالکل صحیح ہے۔ یہ ترجمہ نیویارک سے سنہ ۱۹۲۹ء میں شایع ہوا۔ اس کتاب کا انگریزی میں ایک اور ترجمہ G. R. Potter نے اسی سال ۱۹۲۹ء میں لندن سے شایع کیا۔ دونوں کو ایک دوسرے کے کام کی ظاہراً خبر نہ تھی۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ درانبورغ نے (پیرس ۱۸۹۵) اور جرمن ترجمہ شومان (G. Schumann) نے (جرمنی ۱۹۰۵ء) سے شایع کیا۔ روسی ترجمہ سیلیر (Salier) نے کیا اور مع مقدمہ، تعلیقات و فہرست کتب متعلقہ از کراتشکوفسکی پیٹرد گراڈ سے سنہ ۱۹۲۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ میں نے اردو میں کتاب الاعتبار کا نصف کے قریب ترجمہ کر لیا تھا ایم۔ اے کے امتحان کے فوراً بعد، لیکن پھر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے الحماسۃ البصریہ کی تصحیح و تدوین میں مصروف ہو گیا اور ترجمے کی طرف توجہ نہ کر سکا۔

تعمیر حیات میں حضرت مولانا کے مقدمے سے پہلے مترجم کی لکھی ہوئی ایک تمہید

چھپی ہے، اس میں بعض امور کے سلسلے میں اپنے معروضات پیش کرتا ہوں:

(۱) کتاب الاعتبار پانچ مرتبہ نہیں شایع ہوئی۔ میرے علم میں اس کے صرف دو اڈیشن ہیں ایک درانبورغ کا جو پیرس سے ۱۸۸۴ء میں شایع ہوا اور دوسرا فلپ ھٹی کا جو پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ سے سنہ ۱۹۳۰ء میں نکلا۔ پیرس کا اڈیشن کمیاب نہیں گو ہر نایاب ہے۔ امریکی اڈیشن بھی بازار میں مفقود ہے۔ یہیں نہیں یورپ میں بھی اس کی کمیابی کے باعث اب اس کا عکس چھاپ دیا گیا ہے جس میں کوئی ترمیم، حذف و اضافہ نہیں۔

(۲) درانبورغ کا فرانسیسی اڈیشن لندن (انگلستان) سے نہیں پیرس (فرانس) سے شایع ہوا۔

(۳) "امیر ابو منظفر (مراد ابو المظفر اسامہ بن منقذ سے ہے) خود کوئی مصنف نہیں تھے" لکھنا فاحش غلطی ہے۔ اسامہ بن منقذ مستند، جلیل القدر مصنف اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ ان کی تصانیف کا ذکر الذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) ابن القلانسی (م ۵۵۵ھ) ابن السمعانی (م ۵۶۲ھ) قاضی الرشید بن الزبیر الاسوانی (م ۵۶۳ھ) الشہاب بن فضل اللہ العمری صاحب مسالک الابصار، ابن عساکر (م سنہ ۵۷۱ھ) عماد الاصفہانی (م سنہ ۵۹۷ھ) یاقوت الحموی (م ۶۲۶ھ) ابو شامۃ المقدسی (م ۶۶۵ھ) ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) صلاح الدین الصفدی (م ۷۶۴ھ) الیافعی (م ۷۶۸ھ) کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ان کی بارہ کتابوں کا ذکر عرصہ پہلے درانبورغ کر چکا ہے۔

بعد کو دو کتابوں کا پتا چلا تجرید مناقب امیر المومنین عمر بن الخطاب اور تجرید مناقب عمر بن عبد العزیز۔ یہ دونوں کتابیں جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا ابن الجوزی کی

تصانیف میں ہیں جن کا اختصار اسامہ نے تیار کیا ہے۔ پہلی کتاب کا ایک نسخہ کتبخانہ شاہی برلن میں تھا جو دوسری جنگ عظیم کی ابتدا میں حفاظت کے خیال سے جرمنوں نے برلن سے دور اور نسبتہً چھوٹے غیر اہم شہروں ماربرگ اور ٹیوبنگن میں محفوظ کر دیا تھا کہ ان مقامات پر اتحادیوں کی بمباری کے امکانات بہت کم تھے۔ میں نے تجرید کا یہ نسخہ ۱۹۵۴ء میں وہیں دیکھا تھا۔ کئی سال ہوئے اس ذخیرے کی ایک عربی کتاب کے عکس کے لیے دوست گرامی پروفیسر رودلف زیلہائم (Rudolf Sellheim) صدر شعبہ عربی فرانکفرٹ یونیورسٹی کو لکھا۔ انھوں نے عکس بنوا کر تحفۃً بھیج دیا اور لکھا کہ اب سارا ذخیرۂ مخطوطات پھر برلن واپس بھیج دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ دار الکتب المصریہ میں بھی محفوظ ہے اسامہ کی دوسری کتاب کے بھی دو نسخے اب تک معلوم ہو چکے ہیں۔ ایک کتبخانہ برلن میں (شمارہ: ۹۷۵۹) اور دوسرا کتبخانہ تیموریہ قاہرہ میں (تاریخ: ۱۵۱۳) اس کا مائکروفلم معہد المخطوطات العربیہ قاہرہ (تاریخ: ۵۲۲، فلم شمارہ ۶۰۳) میں شاید اب بھی محفوظ ہو۔ کئی سال پہلے بعض سیاسی حوادث وحالات کی بنا پر معہد المخطوطات کا مرکز قاہرہ سے کویت منتقل کر دیا گیا تھا۔ معلوم نہیں صرف دفتر منتقل ہوا تھا یا سارے مائکروفلم بھی۔ اب جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں کویت جس آزمائش سے گذر رہا ہے معلوم نہیں اس ذخیرے پر جو اسلامی علوم وتہذیب کا بڑا قیمتی ورثہ ہے کیا گذری۔ خدا کرے ہر طرح محفوظ ہو۔

اسامہ کی ایک اور تصنیف کتاب البدیع فی البدیع ہے (بعض نسخوں پر البدیع فی نقد الشعر درج ہے۔) درانبورغ نے برلن، لائیڈن اور قاہرہ کے تین نسخوں کا مطالعہ کر کے اس کتاب پر مضمون لکھا اور اس کے اقتباسات درج کیے ۱۸۹۴ میں

جب میں اسامہ پر اپنا مقالہ لکھ رہا تھا تو معلوم ہوا کہ مکتبۂ بلدیہ اسکندریہ میں بھی اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ جناب مالک رام صاحب نے جو ان دنوں سفارت خانہ ہند سے متعلق اسکندریہ میں مقیم تھے اس کتاب کے کچھ اوراق کے عکس مکمل فہرست مضامین اور بعض اقتباسات خود نقل کر کے بھیجے۔ یہ یوسف بن نعمان بن یوسف المارونینی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اس کا سال کتابت سنہ ۱۱۷۵ھ ہے، لائیڈن کا نسخہ بعد کو میں نے خود سنہ ۱۹۵۴ء کے اواخر میں ہولینڈ جاکر دیکھا۔

اس کا ایک نسخہ مشہور روسی مستشرق کراتشکوفسکی (Kratschkovsky) کو جس نے ابن المعتز کی کتاب البدیع لندن سے شایع کی ہے، لینن گراڈ کے ایشیاٹک میوزیم میں ملا۔ Zapiski (جلد اول ص۳، طبع دوم) میں اس پر اس نے ایک تعارفی مضمون لکھا، اس کا مضمون عربی میں مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق ۱۹۲۵ء میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ بعد کو یہ کتاب جناب احمد البدوی اور جناب حامد عبدالمجید کی تحقیق اور استاذ ابراہیم مصطفیٰ کی مراجعت کے بعد قاہرہ سے ۱۹۶۰ء میں شایع ہوگئی ہے اس کا اختصار بعنوان مقدمۃ الشعر لائیڈن (ہولینڈ) میں محفوظ ہے۔ یہ مختصر رسالہ بھی مصر سے شایع ہوگیا ہے۔

اسامہ کی ایک تصنیف کتاب العصا ہے، پروفیسر مارگولیتھ (جامعہ آکسفرڈ) نے یاقوت کی معجم الادباء کے اپنے اڈیشن میں اور شیخ احمد محمد شاکر نے مقدمہ لباب الآداب میں سہواً اس کتاب کا نام کتاب القضاء لکھا ہے۔ ان اصحاب نے قیاس کیا ہوگا کہ چھڑیوں اور ڈنڈیوں پر کتاب کیا لکھی گئی ہوگی، کتاب العصا، کتاب القضاء کی تصحیف ہوگی حالانکہ درانبورغ اپنی کتاب (La vie d'Ousama) مطبوعہ پیرس ۱۸۸۹-۱۸۹۳

(جلد اول ص ۴۳۳ اور ص ۴۹۹) میں اس کا ذکر کر چکا تھا، لیکن ظاہراً مارگولیتھ اور احمد محمد شاکر کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ کتاب العصا میں نظم و نثر کے بہت قیمتی اقتباسات ہیں جن میں ان تمام عصاؤں کا ذکر ہے جنھیں تاریخ، ادب اور افسانوی دنیا میں اہمیت حاصل ہے۔ اس کے نسخے لائیڈن اور قاہرہ میں محفوظ ہیں۔ ان پر اس قلمی نسخے کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جو یمن سے حاصل ہوا ہے، اور اب میلان (اطالیہ) میں محفوظ ہے۔ اس پر گریفینی (Griffini) نے مشہور جرمن رسالے Z.D.M.G جلد ۶۹ (۱۹۱۵ء) میں ایک مضمون بھی شایع کیا ہے۔

یہاں میں ایک اور نسخے کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں جو میں نے کتبخانۂ خدابخش میں تلاش کیا ہے۔ انگریزی کی مطبوعہ فہرست میں اسامہ بن منقذ کا ذکر نہیں، اس لیے کہ نسخے پر یوسف بن رافع بن شداد کا نام لکھا ہوا ہے، لیکن دراصل یہ اسامہ کی مذکورہ بالا کتاب ہی کا نسخہ ہے۔ اسے الاستاذ عبد السلام محمد ہارون نے نوادر المخطوطات (حصہ دوم ص ۱۲۵ تا ص ۲۱۵) میں قاہرہ سے سنہ ۱۹۵۱ء میں شایع کر دیا ہے۔ لیکن انھیں یمنی اور ہندوستانی نسخوں کے متعلق ظاہراً اطلاع نہ مل سکی اور تصحیح کے وقت وہ ان سے استفادہ نہ کر سکے۔

اس اثنا میں اسامہ کی ایک اور نادر تصنیف کتاب المنازل والدیار کا پتا چلا جو مفقود سمجھی جاتی تھی۔ اس کا نہایت خوبصورت نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا لینن گراڈ کے ایشیاٹک میوزیم میں ملا۔ اس انتخاب کا باعث وہ زلزلہ ہوا تھا جو اگست سنہ ۱۱۵۷ء میں شیزر میں آیا تھا۔ اس میں منازل، دیار، مغانی، اطلال، ربع، دمن اور رسم وغیرہ سے متعلق موضوعات پر قدیم شعراء کے اہم اشعار بھی ملتے ہیں۔ اس کا حال کراتشکوفسکی نے ایک مضمون کے ضمن میں لکھا ہے دیکھیے Zapiski (جلد اول ص ۲۳ تا ص ۱۰۱) اس میں

متن کے کچھ اقتباسات بھی درج کیے ہیں۔ مجلۃ المجمع العلمی العربی (دمشق، جولائی سنہ ۱۹۲۶ء) میں بھی اس کا ذکر دیکھا جا سکتا ہے۔

مجھے اس نسخے کی اطلاع ہولینڈ کے دوران قیام میں ملی اور اسے پڑھنے کا اشتیاق ہوا۔ لائیڈن یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات کے ناظم ولندیزی اسکالر فورہوفے[۱] کے مشورے پر میں نے لینن گراڈ میوزیم کے ناظم کو لکھا کہ میں عربی کا ایک طالب علم ہوں، روکیفلر فاؤنڈیشن امریکہ کی فیلو شپ پر سر ہملٹن گب کی نگرانی میں آکسفورڈ میں ریسرچ کر رہا ہوں۔ براہ کرم کتاب المنازل والدیار کے نسخے کی مائکروفلم میرے لیے بنوا دیجیے اور شرح اجرت سے اطلاع دیجیے۔ جواب کی جگہ دو ہی ہفتے میں ایک پارسل مجھے موصول ہوا جس میں مذکورہ کتاب کی بہت صاف ستھری مائکروفلم تھی اور ڈائرکٹر کا خط کہ آپ کی علمی ضرورت کے پیش نظر فلم فوراً بنوا کر بھیجی جا رہی ہے اور میوزیم کی طرف سے بطور تحفہ۔ اس علم دوستی پر مجھے اپنے ملک کے کتبخانے اور وہ اصحاب یاد آتے ہیں جن کے پاس علمی ذخیرے ہیں، اکثر تو خطوں کے جواب ہی نہیں دیتے۔ جو دیتے ہیں ان کی مہینوں بلکہ برسوں یاد دہانیاں کرائی ہوتی ہیں، اس پر بھی مقصد کبھی حاصل ہوتا ہے کبھی نہیں۔ میں برسوں سے بعض مشاہیر کے خطوط جمع کر رہا ہوں بعض اصحاب کو متعدد بار ان کی نقل کے لیے خطوط لکھے، کم لوگوں نے توجہ کی۔ یہ مشرق و مغرب کا فرق ہے ایک روسی نژاد جسے اسلام کے ورثے سے دور کا بھی تعلق نہیں، تقریباً ۵۰۰ صفحات کی کتاب کی مائکروفلم فوراً بنوا کر ایک اجنبی طالب علم کو بطور تحفہ بھیج دیتا ہے اور ایک ہم لوگ ہیں کہ علمی تعاون کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔ الا ماشاء اللہ۔ یہ غالباً سنہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں ایک مسلم روسی مستشرق پروفیسر انس خالیدوف نے اس کتاب کا عکسی اڈیشن روسی مقدمے اور تعلیقات کے ساتھ لینن گراڈ

۱؎ P. Voorhoeve

نے شایع کر دیا۔ اسی عکسی اڈیشن کی بنیاد پر سوریہ کے ایک فاضل نے اس کا ایک اڈیشن دمشق سے ۱۹۶۵ء میں شایع کیا ہے۔

لباب الآداب تحقیق الاستاذ احمد محمد شاکر طبع قاہرہ کا ذکر اوپر گزرا۔

اسامۃ بن منقذ کی جو تصانیف اب تک پردۂ خفا میں ہیں اور کسی کتب خانے میں ان کے وجود کی اب تک اطلاع نہیں ملی۔ وہ حسب ذیل ہیں: تاریخ القلاع والحصون، أزهار الأنهار، نصيحة الرعاة، التجائر المربحة والمساعي المنجحة، اخبار النساء، التأسي والتسلي، النوم والاحلام، الشيب والشباب، اخبار البلدان، كتاب في اخبار أهله (یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب الاعتبار ہی ہو یا یہ کہ یہ ایک علحدہ کتاب ہو جس میں اپنا اور اپنے خاندان کے حالات انھوں نے قلم بند کیے ہوں) ذیل يتيمة الدهر (حسب روایت یاقوت الحموی، لیکن علامہ ذہبی نے ذیل خريدة القصر للباخرزی سہواً لکھ دیا ہے، باخرزی کی کتاب دمية القصر ہے جو ذیل ہے ثعالبی کی يتيمة الدهر کی۔ خريدة القصر عماد الدين الاصفہانی کی تصنیف ہے۔ اس کا بھی خفیف سا امکان ہے کہ اسامہ نے خريدة القصر کی بھی ذیل لکھی ہو اور ذہبی نے غلطی سے اسے الاصفہانی کے بجائے الباخرزی کی طرف منسوب کر دیا ہو۔)

ناظرین معارف کے لیے یہ خبر باعث دلچسپی ہوگی کہ اسامہ کی ایک گم شدہ تصنیف التاريخ البدري کا ایک نسخہ چند ماہ پہلے دریافت ہو گیا ہے، اس کی اطلاع مجھے ابھی ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ/ جولائی ۱۹۹۰ء میں مکہ مکرمہ میں محمد عزیز شمس صاحب سے ملی۔ مجمع البحوث الاسلامية، اسلام آباد کے کتاب خانے میں منتشر اور پراگندہ اوراق کا

ایک مجموعہ تھا۔ ناقص الطرفین ہونے کی وجہ سے نہ نام کتاب کا معلوم ہو سکا تھا نہ مصنف کا۔ لیکن حسن اتفاق سے اس میں مصنف نے اپنی بعض کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور یہ کتابیں اسامہ بن منقذ کی ہیں، اس طرح معلوم ہو سکا کہ یہ اسامہ کی کوئی تصنیف ہے۔ پھر چونکہ اس کتاب میں شہدائے بدر کا ذکر ہے اس لیے یہ یقین ہو گیا کہ یہ اسامہ بن منقذ کی التاريخ البدري ہی ہے۔ یہ کتاب اب تک اس کی بعض دوسری کتابوں کی طرح مفقود سمجھی جاتی تھی۔ محمد عزیز شمس صاحب جنھوں نے اس کتاب کا انکشاف کیا ہے اس پر ایک تعارفی مضمون شایع کرنے والے ہیں۔

اسامہ بن منقذ صرف مصنف ہی نہیں شاعر بھی تھا اور صاحب دیوان شاعر۔ دیوان دو جلدوں پر مشتمل تھا اور خود اسامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ابن خلکان کے پاس تھا۔ جس سے اس نے وفیات الاعیان میں کچھ منتخب شعر درج کیے ہیں۔ قاضی الرشید بن الزبیر الاسوانی (م ۵۶۳ھ) الشہاب بن فضل اللہ العمری الذہبی، ابو شامۃ المقدسی اور عماد الاصفہانی کی نظر سے بھی اسامہ کا دیوان گزرا تھا۔ دیوان، عبد اللہ بن اسعد الیافعی (م ۷۶۸ھ) کے زمانہ تک موجود تھا۔ آٹھویں صدی کے بعد ظاہراً یہ دیوان مفقود الخبر ہو گیا۔ اس لیے کہ یافعی کے بعد کوئی شخص اس کے دیکھنے کا مدعی نہیں۔ درانبورغ نے آج سے سو سال پہلے اسکے کچھ اشعار گوتھا (جرمنی) کے ایک نامکمل نسخے اور وہاں محفوظ شعری مجموعوں سے جمع کر کے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں جو اس نے اسامہ پر لکھی ہے پیرس سے ۱۸۸۹-۱۸۹۳ء میں شایع کیے۔ لیکن اس میں اشعار کی تعداد بہت کم تھی۔ اس کی اہمیت اور دیوان کی نایابی کے پیش نظر ۱۹۴۹ء میں جسے اب چالیس سال ہوئے ہیں، میں نے استاذ عبد العزیز المیمنی کی نگرانی میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مصادر سے اسامہ کے اشعار جمع کر کے ایک دیوان مرتب کر کے

اسے اس انگریزی مقالے میں جسے میں نے ایم اے کے امتحان کے ایک پرچے کی جگہ لکھا تھا ضمیمے کے طور پر شامل کر دیا تھا۔ سال دو سال کے بعد ایک ایرانی فاضل آقائے محیط طباطبائی نے جو اس وقت سفارت خانہ ایران دہلی میں مستشار فرہنگی تھے (اور اس وقت بھی پیرانہ سالی کے باوجود تہران میں علمی سرگرمیوں میں مصروف ہیں) اطلاع دی کہ ایرانی پارلیمنٹ کے کتب خانے میں دیوان اسامہ بن منقذ محفوظ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم و مغفور نے جو اس وقت علی گڑھ میں وائس چانسلر تھے اس کا عکس فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ کوشش ابھی مشکور نہیں ہوئی تھی کہ اطلاع ملی کہ دار الکتب المصریہ قاہرہ میں دیوان کا ایک نسخہ ۶۸۸ھ کا مکتوبہ محفوظ ہے۔ اس پر بعد کو مجلۂ الکتاب (۳: ۵۰۶) میں ایک تعارفی مضمون بھی شایع ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں جب میں شرق اوسط اور یورپ کے علمی سفر پر روانہ ہوا تو معلوم ہوا احمد البدوی اور حامد عبد الحمید نے اسے مرتب کر لیا ہے، یہ ۱۹۵۳ء میں قاہرہ سے شایع ہوا۔ ان دونوں محققین کو نہ نسخہ ایران کا علم ہو سکا اور نہ درانبورغ کی مساعی کا اور نہ میری ناچیز کوششوں کا، ورنہ دیوان زیادہ مکمل صورت میں انطباع پذیر ہوتا۔

دیوان مطبوعہ سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ میرے مرتب کردہ مجموعۂ اشعار میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو دیوان مطبوعہ میں نہیں پائے جاتے۔ اس لیے اس مجموعے کی کچھ اہمیت اب بھی باقی ہے۔ دیوان اسامہ کے ایک مکمل اور علمی و تنقیدی اڈیشن کی اب بھی ضرورت ہے۔ خدا کرے کسی دن دیوان کے اس نسخے (یا اس کے کسی نقل) کا انکشاف ہو جائے جو دو جلدوں میں مرتب ہوا تھا اور ابن خلکان کے زیر مطالعہ تھا اور بخط مصنف تھا، جہاں تک یاد آتا ہے اب تک کے معلوم نسخوں میں اشعار صرف ایک جلد میں جمع کیے گئے ہیں۔

ممکن ہے یہ اصل دیوان کا انتخاب ہو اور یہی بعد کے نقل نویسوں کے پیش نظر رہا ہو۔

علامہ عبد الفتاح ابو غدہ حفظہ اللہ نے کتاب الاعتبار کے اپنے مقدمے میں یقین ہے اسامہ کے حالات کے سلسلے میں سارے مصادر دیکھ لیے ہوں گے، یہاں دو کتابوں کا ذکر ضروری ہے جو ممکن ہے فاضل محقق کے پیش نظر نہ رہی ہوں اور انھیں کہیں حاصل ہو جائیں۔ یہ الذہبی کی تاریخ الاسلام کی وہ جلد ہے جو شاید ابھی شایع نہیں ہوئی۔ اس کے نسخے برٹش میوزیم اور رام پور میں محفوظ ہیں۔ واضح رہے کہ الذہبی پہلا مصنف ہے جس کے پیش نظر کتاب الاعتبار رہی ہے اور اس کتاب کا اس نے نسبتہً تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس سے عبارات بھی نقل کیے ہیں۔ فلپ ہٹی کو تو اس کی خبر نہیں ورنہ کتاب الاعتبار کے بعض نصوص کی تصحیح و تفہیم میں وہ اس سے ضرور مدد لیتا اور متن میں اضافہ بھی کرتا۔ الذہبی لکھتے ہیں:

"وعندی له مجلد یخبر فیه بما رأی من اهوال قال حضرت من المصافات والوقعات مهول اخطارها واصطلیت من سعیر نارها وباشرت الحرب وأنا ابن خمس عشرة سنة إلى أن بلغت مدى تسعین وصرت من الخوالف خدین المنزل و عن الحروب والجهاد بمعزل لا أعد لهم ولا أدعى لدفاع مسلم بعد ما کنت أول من تثنى علیه الخناصر وأکبر العدد لدفع الکبائر اول من یقوم السنجقیة عند حملة الاصحاب و آخر جاذب عند الجولة لحمایة الاعقاب، وفى ذلک أقول:

کم قد شهدت من الحروب فلیتنی	فی بعضها من قبل نکسی أ قتل
فالقتل أحسن بالفتى من قبل أن	یفنى ویبلیه الزمان وأجمل

وأبيك ما أحجمت عن خوض الردى في الحرب يشهد لي بذاك المنصل
لكن قضاء الله أخرني إلى أجلي الموقت لي، فما ذا أفعل"

نثر و نظم کے یہ عبارات کتاب الاعتبار کے دونوں مطبوعہ نسخوں سے غیر حاضر ہیں اسلیے کہ ان اڈیشنوں کی بنیاد مکتبۂ اسکوریال (ہسپانیہ) کا نسخہ ہے جس کے ابتدائی ۲۱ اوراق ضایع ہوگئے ہیں۔ الذہبی کے پاس الاعتبار کا مکمل نسخہ تھا جس سے اس نے یہ عبارات و اشعار نقل کیے ہیں۔

اس کے بعد الذہبی لکھتے ہیں:

"ثم أخذ يعدد ما حضره من الوقعات الكبار، قال فمن ذلك وقعة
... ثم أخذ يسرد عجائب ما شاهد في هذه الوقعات و
يصف فيها شجاعته وإقدامه"

جہاں اوپر کی عبارت میں میں نے نقطے لگائے ہیں وہاں سے ایک صفحے کی عبارت میں نے چھوڑ دی ہے۔ اس میں ان جنگوں کی فہرست درج کی ہے جو ۵۰۷ھ سے ۵۴۹ھ تک لڑی گئی ہیں اور جن میں اسامہ شریک تھے الاعتبار کے ہسپانوی نسخے اور دونوں اڈیشنوں میں ۵۰۷ھ سے ۵۳۱ھ کے حوادث و واقعات کا ذکر نہیں اس لیے کہ ان کا حال ان اکیس[21] اوراق میں لکھا گیا تھا جو اب ضایع ہوگئے ہیں، ہاں الذہبی کی تاریخ الاسلام سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ضایع شدہ اوراق میں کن حوادث کا ذکر ہے۔ الذہبی کی عبارت یہ ہے:

"قال فمن ذلك وقعة كانت بيننا وبين الاسماعيلية في قلعة شيزر لما توثبوا على الحصن في سنة سبع وخمس مئة، و

وقعة كانت بين عسكر حماة وعسكر حمص في سنة خمس وعشرين وخمس مئة، ومصاف تكريت بين أتابك زنگی بن آقسنقر وبين قراجا صاحب مرين في سنة ست وعشرين ومصاف بين المسترشد بالله وبين أتابك زنگی وبين الارتقية وصاحب آمد على آمد في سنة ثمان وعشرين، ومصاف على رفنية بين أتابك زنگی وبين الفرنج في سنة احدى و ثلاثين، ومصاف على قنسرين بين اتابك وبين الفرنج لم يكن فيه لقاء في اثنتين وثلاثين ..."

"معرکہ قنسرین" سے ہسپانوی نسخے کے اندراجات شروع ہوجاتے ہیں، اگر ضایع شدہ اکیس[21] اوراق اس کتاب کے مل جائیں تو ان سے ان معرکوں پر بھی روشنی پڑے گی۔ جن کی فہرست الذہبی نے پیش کی ہے۔ ابتدا میں قاعدے کے مطابق اسامہ کا دیباچہ بھی ضرور ہوگا۔ اس سے بھی بعض ضروری معلومات حاصل ہوسکیں گے، سطور بالا کی اہمیت یہ ہے کہ یہ الاعتبار کے مطبوعہ نسخوں میں موجود نہیں اور یہاں ان کے نقل کی وجہ جواز یہی ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ اسماعیلیہ اور اصحاب شیزر کے معرکوں اور حوادث کا ذکر الاعتبار میں متعدد جگہ آیا ہے دیکھئے صفحات ۷۷-۷۹، ۱۱۶، ۱۲۳، ۱۵۹، ۱۶۲، اسماعیلیوں کے حملوں کا ذکر ابن الاثیر (۱۰: ۲۷۲) اور سبط ابن الجوزی کی مرآۃ الزمان (۳: ۵۴۸) میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

الذہبی نے ابن السمعانی صاحب کتاب الانساب اور عماد الدین کاتب اصفہانی

صاحب خریدۃ القصر سے بھی اسامہ کے بارے میں کچھ نصوص نقل کیے ہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ خریدۃ القصر (قسم الشام) تحقیق الاستاذ شکری فیصل مرحوم میں یہ نص موجود نہیں انھیں بھی اس وقت خریدۃ کا ناقص نسخہ ملا تھا، ہاں یاقوت الحموی نے معجم الادباء (۵: ۱۹۱) میں یہ عبارت نقل کی ہے اور وہ خریدۃ القصر کا حوالہ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے پاس اس کتاب کا مکمل نسخہ تھا۔ الذہبی کی تاریخ الاسلام ۳۶ جلدوں میں مکمل ہوئی تھی کسی کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ نہیں ملتا، اس کی مختلف جلدیں مختلف کتبخانوں میں بکھری پڑی ہیں۔

ایک اور قدیم مصنف یحیٰ بن ابی طئ النجار (م ۶۳۰ھ) ہے جس نے اپنی کتاب تاریخ الشیعۃ کئی جلدوں میں مرتب کی تھی۔ یہ نویں صدی ہجری تک موجود تھی۔ اس کے بعد ظاہراً فنا ہوگئی۔ ابن قاضی شہبۃ الاسدی (م ۸۵۱ھ) نے الاعلام بتاریخ الاسلام کی تالیف میں اس سے کام لیا ہے۔ اس نے لکھا ہے: صنف تاریخ الشیعۃ وھو مسودۃ فی عدۃ مجلدات، نقلت منہ کثیراً" افسوس ہے کہ ابن شہبۃ کی الاعلام کی طباعت اب تک مکمل نہ ہوسکی۔ ایک دو جلدیں ڈاکٹر عدنان درویش نے دمشق سے شایع کی ہیں اسکے بعد شاید اس کی اشاعت رک گئی حالانکہ یہ بہت اہم کتاب ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں اسامہ کا ذکر کیا ہے اور اپنے والد حمیدہ بن ظافر الغسانی الحلبی کا قول نقل کیا ہے کہ ان سے اسامہ کی متعدد ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اس کتاب کو میں نے مشرق و مغرب کے کتبخانوں میں بہت تلاش کیا، نہیں ملی۔ کسی دن اگر اس کتاب کا انکشاف ہوا تو ممکن ہے اسامہ کے بارے میں کچھ ایسے معلومات ملیں جو اس وقت ہمارے سامنے نہیں۔ لیکن اس کا مطالعہ بہت احتیاط اور تنقیدی نظر سے کرنا چاہیے

الذہبی نے تاریخ الاسلام کی مذکورہ بالا جلد میں اسامہ کے بارے میں ابن ابی طئ سے یہ عبارت نقل کی ہے۔

"کان امامیاً، حسن العقیدۃ، الا أنہ کان یداری عن منصبہٖ ویظہر التقیۃ، وکان یرفد الشیعۃ، ویصل فقراءھم ویعطی الاشراف"

جو محل نظر ہے۔ ظاہراً وہ بھی یوسف بن یحیٰ الصنعانی مصنف نسمۃ السحر فیمن تشیع وشعر (نسخہ ور برلن رقم: ۷۴۲۳) اور ان دوسرے مصنفین میں ہے جسے اس بات کا شوق ہے کہ زیادہ سے زیادہ مصنفین و شعرا کو مذہب امامیہ کا پیرو ثابت کیا جائے ورنہ اسامہ بن منقذ کی کسی تصنیف اور معاصر اور قریب العہد مصنفین کی کسی کتاب سے ابن ابی طئ کے بیان کی شہادت نہیں ملتی۔

اسامہ بن منقذ، اس کی کتاب الاعتبار اور اس کی دوسری تصانیف پر جو توجہ و عنایت فرانسیسی، روسی، انگریز، جرمن اور امریکی علمار نے کی، اسکی انھیں داد نہ دینا ظلم کے مرادف ہوگا۔ فرانسیسی مستشرق درانبورغ نے تو اپنی زندگی کا بڑا حصہ اسامہ اور اس کی تصانیف کی تحقیق و اشاعت کی نذر کردیا۔ شرق اوسط کے بعض اہل قلم نے بعد کو کچھ توجہ کی، عدم وسائل اور دلچسپی کی کمی کی وجہ سے ہندوستان/پاکستان بہت پیچھے رہا۔ چالیس سال پہلے میں نے کچھ ناچیز سی کوشش کی لیکن اس کے بعد نہ اپنی انگریزی کتاب شایع کرسکا نہ اس کا مجموعۂ شعری اب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کتاب الاعتبار کے نئے شامی اڈیشن پر مقدمہ لکھ کر کچھ تلافی مافات کردی ہے۔ پاکستان میں اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کی

ترتیب شروع ہوئی تو اس کے ناظم عمومی پروفیسر محمد شفیع (اورینٹل کالج لاہور) نے روسی فاضل کراتشکوفسکی کا وہ مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (انگریزی) میں لائیڈن سے چھپا تھا، میرے پاس نظر ثانی و اضافے کے لیے بھیج دیا، اتنے بڑے مستشرق کے مقالہ پر اضافہ آسان نہ تھا، بہر حال میں نے مقالے میں کوئی ترمیم نہیں کی اپنی طرف سے کھڑے بریکٹوں میں جابجا اضافات و استدراکات درج کرکے مضمون واپس بھیج دیا جو دائرہ کی دوسری جلد میں (ص ۵۳۳ تا ۵۳۸) کراتشکوفسکی اور میرے ناموں سے شایع ہوا ہے۔ یہ جلد لاہور سے ۱۹۶۶ء میں چھپ چکی ہے دائرہ معارف اسلامیہ کی اب تک ۲۱ جلدیں شایع ہو چکی ہیں لیکن یہاں کتنوں کے پاس یہ مجلدات ہیں اور کتنوں نے ان کا مطالعہ کیا ہے!

مطبوعات جدیدہ

رسالوں کے خاص نمبر اور نئے رسالے

غالب نامہ حافظ محمود شیرانی نمبر — مرتبہ پروفیسر نذیر احمد وغیرہ، کتابی سائز، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۸ مع ڈسک کور، قیمت ۴۰ روپے۔

پتہ: غالب نامہ غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲۔

مجلہ غالب نامہ کے فخر و امتیاز کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کے مدیر اعلیٰ فارسی ادبیات کے مایہ ناز عالم اور اردو کے مشہور محقق پروفیسر نذیر احمد ہیں، یہ اپنے باوقار محققانہ مضامین اور امتیازی خاص نمبروں کے علاوہ حسن طباعت کے لحاظ سے بھی اردو کا بہت ممتاز رسالہ ہے، زیر تبصرہ نمبر اردو و فارسی کے ایک بڑے محقق و فاضل حافظ محمود شیرانی سے متعلق ایک اہم علمی و ادبی دستاویز ہے جو فروری ۱۹۹۰ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایوان غالب نئی دہلی میں منعقدہ حافظ محمود شیرانی پر یک روزہ سمینار میں پیش کیے گئے اور بعض دوسرے فاضلانہ مضامین پر مشتمل ہے، اس کا ہر مضمون بلند پایہ اور قدر و قیمت کا حامل ہے، ابتدا خود حافظ صاحب کے ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون "آلات آتش بازی" سے کی گئی ہے، اس کے بعد فاضل مدیر نے شیرانی صاحب کی ان تحقیقات کا جائزہ لیا ہے جو فارسی زبان و ادب سے متعلق ہیں، اس میں فردوسی اور شاہنامہ، تنقید شعر العجم اور ہندوستانی فارسی ادب کو موضوع بنا کر حافظ صاحب کے

کمالات اور کارناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس میں اور لائق مدیر کے دوسرے
مقالہ "شیرانی کی تحقیقات پر ایک نظر" میں بعض ایسے مآخذ کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے
شیرانی صاحب ناواقف تھے، انھوں نے مولانا شبلیؒ کی شعر العجم کی پہلی دونوں جلدوں
پر نکتہ چینی میں جو خوردہ گیری کی ہے اس کو صحیح قرار دینے کے باوجود مقالہ نگار نے
شعر العجم کے حسنِ قبول اور اہمیت و عظمت کا اعتراف کیا ہے لیکن ان کے اس بیان سے
اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ "تنقید شعر العجم" کا مقصد مولانا شبلیؒ کی علمی فضیلت کی منقصت
نہ تھی (ص ۴۸) خود اسی نمبر کے ایک مضمون "تنقید شعر العجم" میں پروفیسر سید امیر حسن
عابدی نے لکھا ہے "تنقید شعر العجم کو پڑھ کر غالب اور مولف برہان قاطع یاد آجاتے ہیں
جس طرح غالب نے برہان قاطع کے مولف کو اپنا ایک فرضی دشمن تصور کرلیا اور گالیوں
پر اتر آئے، اسی طرح حافظ صاحب نے تنقید شعر العجم میں کسی ذاتی دشمنی اور کینہ کا ثبوت
دیا ہے، وہی بات جب دوسرے کہتے ہیں تو تردید کرتے ہوئے اسے برداشت کرلیتے
ہیں مگر علامہ کے خلاف محاذ آرائی، طنز اور حقارت آمیزی کا لہجہ اختیار کیا ہے جو
علمی دنیا میں موزوں نہیں" (ص ۲۵) عابدی صاحب کا مضمون بڑا معتدل، منصفانہ
اور "ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں" کا مصداق ہے، انھوں نے دونوں کے کمالات
کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے میدان الگ الگ بتائے ہیں اور آخر میں اپنا مختتم
فیصلہ یہ دیا ہے "علامہ شبلیؒ ایک بین الاقوامی شخصیت کے مالک ہیں جو حافظ صاحب
کو حاصل نہیں" (ص ۲۵)، حافظ صاحب کا ایک بڑا کارنامہ اور ان کی خاص دریافت
"پنجاب میں اردو" کو سمجھا جاتا ہے، اس پر پروفیسر عبد الغفار شکیل اور ڈاکٹر محمد انصار اللہ
نظر کے مضامین درج ہیں، اول الذکر نے زبان اردو کے آغاز کے متعلق حافظ صاحب

کی رائے کو صحیح بتاتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اس رائے کو کہ "اردو کا ہیولیٰ
وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا" قیاس آرائی کہا ہے، حالانکہ محققین کی طرف سے دونوں
کی رائے پر بے اطمینانی ظاہر کی گئی ہے، حافظ صاحب کے پوتے اور نواسے ڈاکٹر شیرانی
کا مضمون بالکل جانبدارانہ اور مداحانہ ہے، وہ ان کے اسلوب کو سر سید، محمد حسین
آزاد، مولانا حالی، مولانا شبلی اور مولوی عبد الحق سب کے اسلوب سے مکمل اور برتر
بتاتے ہیں، شیرانی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ابراہیم ڈار پر ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی
کا مقالہ پرمغز ہے، پروفیسر خلیق انجم کا مضمون "محمود شیرانی کا قیام لندن" بھی پر از
معلومات ہے۔ یہ نمبر متنوع اور محققانہ مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اصحابِ
ذوق کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے۔

ہمدرد نونہال خاص نمبر مرتبہ جناب مسعود احمد برکاتی صاحب، متوسط تقطیع
کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۰۳، مصور، قیمت ۱۲ روپیے، پتہ: ہمدرد
نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد کراچی ۷۴۶۰۰۔

حکیم محمد سعید کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، ان کی خدمت و عمل کا ایک
میدان بچے بھی ہیں، رسالہ نونہال کو انھوں نے اپنے ملک کے نونہالوں کی ذہنی
و اخلاقی تربیت کے لیے جاری کیا ہے جس میں ان کی دلچسپی کے لیے مفید، سبق آموز
اور معلوماتی مضامین دلچسپ نظمیں اور کہانیاں آسان اور عام فہم زبان اور موثر اور
دلکش انداز میں شایع کی جاتی ہیں یہ خاص نمبر بھی بچوں کی دلچسپی کے مضامین
اور کہانیوں پر مشتمل ہے، جس کو پڑھ کر وہ فرحت محسوس کریں گے، اس سے ان کی
مذہبی، سائنسی اور تاریخی معلومات میں اضافہ ہوگا، نونہالوں کے خیال سے اس میں

جابجا تصویریں بھی درج ہیں۔

البلاغ مرتبہ جناب ارشد مختار صاحب، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۶۶، خوبصورت ٹائٹل، قیمت سالانہ سنّو روپیے فی شمارہ دس روپیے پتہ: مجلہ البلاغ، دار المعارفہ ۳۱ احمد علی بلڈنگ، بھنڈی بازار، بمبی ۳۔

مولانا مختار احمد ندوی امیر مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ایک فعال شخص ہیں، انھوں نے اپنے صاحبزادگان کے اشتراک سے الدار السلفیہ قائم کیا ہے جو ہندوستان میں عربی کتابوں کی طبع و اشاعت کا بڑا مرکز ہے، اب اس نے اردو کتابوں کی اشاعت کی جانب بھی توجہ کی ہے اور مولانا کی سرپرستی میں ان کے صاحبزادہ ارشد مختار صاحب نے یہ دینی و تعلیمی ماہنامہ جاری کیا ہے جو طویل اور بھاری بھرکم کے بجائے مختصر اور عام فہم مضامین پر مشتمل ہوتا ہے، شروع کے صفحات قرآن و حدیث کے مطالب کی دلکش ترجمانی کے لیے مخصوص ہوتے ہیں، پھر اسلامی عقائد، عالم اسلام، اہم اشخاص، فتاوی اور دوسرے اصلاحی و تعلیمی موضوعات پر مضامین ہوتے ہیں عورتوں اور بچوں کی دلچسپی کا بھی خیال رکھا گیا ہے، چوتھے شمارے کے دونوں اداریے وزن دار ہیں۔ رسالہ کی ترتیب و طباعت میں دلکشی اور مضامین میں تنوع ہوتا ہے۔ ہم اس ہونہار کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اسکی تنومندی اور سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

نور توحید مرتبہ مولانا عبداللہ مدنی، قیمت سالانہ ۲۵۰ روپیے، پتہ: بتوسط مسعود احمد شوز مرچنٹ، بڑھنی، سدھارتھ نگر، یو۔پی۔

یہ ماہوار رسالہ دو تین برسوں سے نیپال سے شایع ہو رہا ہے جو واقعی اسم بامسمٰی ہے۔

"ض"

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ